ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۱۱ اکتوبر ۱۹۹۴ء

☆ داعیٔ تحریک کے چوتھے خطبۂ خلافت کی آخری قسط
☆ عدلیہ کے وقار کا قافیہ کب سے تنگ ہو رہا ہے؟
☆ اہلِ کراچی کو کس بات کی سزا دی جا رہی ہے!

حدیثِ امروز

رامے صاحب! آپ کی بھی اتنی ہی سنی جاتی ہے جتنی ہماری

اپوزیشن کی طرف سے ۱۱/اکتوبر کو "پہیہ جام" کے پروگرام کا اعلان ہونے کے بعد پنجاب اسمبلی کے دانشور اور فنکار سپیکر جناب حنیف رامے نے اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے جس رد عمل کا اظہار کیا' اس پر ایک قومی اخبار نے سرخی لگائی ہے کہ "اپوزیشن بے مقصد ایجی ٹیشن نہ کرے' حکومت اپوزیشن کا مذاق نہ اڑائے : رامے"۔ ہمارے یہ معتدل مزاج سپیکر پیپلزپارٹی کی تاسیس کی راہ ہموار کرنے بلکہ قبل ازیں اس کے وجود کے لئے فکری جواز فراہم کرنے والے معدودے چند لوگوں میں شامل تھے۔ "قائد عوام"--- اور یہ خطاب بھی انہی کی عطا ہے--- کے زیر سایہ پنجاب کی وزارتِ علیا تک پہنچ کر زیر عتاب آئے تو شاہی قلعہ کی "سیر" بھی کی۔ پھر "اصلی تے وڈی" مسلم لیگ میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہاں وہ وسعت نہ پائی جو انہیں اپنے "بیاں" کے لئے درکار تھی تو من مرضی کی ایک پارٹی کھڑی کرنے کی کوشش کی' اس میں ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد "ڈالر کی تلاش" میں خود چچا سام کے دیس میں جا ڈیرا جمایا اور پھر وہاں سے واپسی پر مرحوم جنرل ضیاء الحق کے کاشانہ اقتدار کے ایک گوشے میں اپنے لئے چار ہی تنکے جمع کر پائے تھے کہ "وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا"۔ اب پھر وہ سچے اور پکے پارٹی لیڈر ہیں لیکن بس نام کے' ورنہ بی بی کی پی پی میں ان کی شنوائی نہیں ہوتی اور اس اعتبار سے ان کی حیثیت پرانے "انکلوں" سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان کی یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی جو اخبار نے اپنی تین کالمی سرخی میں بیان کی ہے۔ اس کے نتیجے میں بے نظیر حکومت جائے یا نہ جائے پہیہ جام ضرور ہو گا اور پوری شان سے ہو گا کہ یہ "قوم" کے مزاج سے حیرت انگیز مطابقت رکھتا ہے۔ دس دس بارہ بارہ نوجوانوں اور لڑکوں بالوں کی ٹولیاں "روڑا بہ کف" اور "ڈنڈا بدست" جذبۂ عمل سے سرشار مستعد کھڑی ہوں تو پولیس کی گاڑیوں کے سوا کون کسی بھی سڑک پر اپنی گاڑی کو حرکت دینے کی ہمت کرے گا اور پھر اس کے پیچھے لمبی ہوتی قطاریں زندگی کے معمولات کو شل نہ کر دیں گی؟۔ اور سچ تو یہ ہے کہ لوگ خوفِ فسادِ خلق سے زیادہ اپنی گاڑیوں کی خیریت جاں اور خود اپنی راحتِ تن کے خیال سے اپنی گاڑیاں بند ہی کیوں نہ رکھیں گے؟۔

گلی محلوں کی خاک چھانتے اور محرومیوں پر مشتمل اپنی کمائی میں مسلسل اضافہ کرتے قوم کے یہ بچے اور وہ نوجوان جن کی قسمت پر دولت کی ظلم کی حد تک غیر منصفانہ تقسیم نے مہر لگا دی ہے' ڈانٹ ڈپٹ سننا اور "گالی کھانا صبح و شام" جن کا کام ٹھہرا اور ذلت کے احساس نے جن کی خوبصورت صورتیں بگاڑ کر رکھ دی ہیں' انہیں بے بسی و بے اختیاری کے حبسِ دوام سے چند ساعتوں کی جو رہائی ملے گی اس میں وہ پاگل نہ ہو جائیں تو اور کیا کریں گے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے ان بے کسوں کو کسی بھی بہانے ملا ہوا اپنا یہ عارضی "اختیار" بڑی شان سے اور پوری طرح مؤثر انداز میں استعمال کرتے پہلے بھی کئی بار دیکھا اور یہ سطور سپردِ قلم کرتے ہوئے بھی چشمِ تصور سے صاف دیکھ رہے ہیں۔

رامے صاحب کی نثری دہائی کی طرح ہماری یہ منظوم صدا بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح دب کے رہ جائے گی کہ

کوئی نہ جو کر پایا' اب وہ کام کرو
لوگو' وقت کا پہیہ بھی تو جام کرو

(باقی صفحہ ۴ پر)

قیمت ۶ روپے

الہدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرہ

(آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

اور لوگوں میں سے ایک وہ بھی ہے کہ جس کی باتیں تمہارے دل کو لبھاتی ہیں دنیا کی زندگی میں' اور وہ گواہ بناتا ہے اللہ کو اپنے دل کی بات پر حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے○

اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتا ہے تو زمین میں بھاگ دوڑ کرتا ہے تاکہ اس میں فساد مچائے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرے' اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا○

(کہ مدینہ کی اس چھوٹی سی بستی میں جسے نبی اکرم ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا' ایک طبقہ منافقین کا بھی موجود تھا۔ یہ لوگ کردار کے بودے لیکن گفتار کے غازی تھے۔ اپنی چرب زبانی سے اپنی عملی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے اور اپنی خوش گفتاری سے دوسروں کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے' اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے اللہ کو گواہ ٹھہرانا یعنی بات بات پر اللہ کی قسم کھانا ان کا معمول تھا۔ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑے نیک جذبات کا اظہار کرتے لیکن جب وہاں سے ہٹتے تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اسلام کو زک پہنچانے کے لئے ہوتی۔ انہی منافقین میں ایک نمائندہ کردار اخنس ابن شریق نامی منافق کا تھا کہ جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی نیاز مندی ظاہر کرتا اور اسلام سے اپنے دلی لگاؤ کا اظہار کرتے نہ تھکتا لیکن جب رخصت ہوتا تو مسلمانوں کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا' کبھی کسی کھیت کو آگ لگا دیتا اور کبھی موقع ملنے پر کسی جانور کے پاؤں کاٹ ڈالتا اور اس طرح مسلمانوں کو تکلیف پہنچا کر اپنے نفس کی تسکین کا سامان کرتا)

اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو گھمنڈ آمادہ کرتا ہے اسے گناہ پر' سو ایسے شخص کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے○

(اور جب ایسے کسی شخص کو اس کے ناروا طرز عمل کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور اصلاح حال کی دعوت دی جاتی ہے تو اس کے پندار پر چوٹ پڑتی ہے اور جھوٹی عزت نفس اسے اصلاح سے باز رکھتی ہے۔ وہ کبھی اپنی غلطی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور اپنی اکڑ میں کوئی خم پیدا نہیں ہونے دیتا۔ منافقین کے کردار کے اس پہلو کو قرآن نے خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔۔۔ جہنم کی آگ ہی ایسے خود سر لوگوں کا اصل علاج ہے۔ اس کی ایک لپٹ ان کی ساری اکڑفوں نکالنے کے لئے کافی ہوگی)

اور لوگوں میں سے ایک شخص وہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو تج دیتا ہے اللہ کی رضاجوئی کے لئے' اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے○

(اس کے برعکس ایک کردار وہ ہے جو مومنین صادقین کا ہے۔ جنہوں نے اپنا گھر بار اور مال و اسباب سب کچھ اللہ کی راہ میں تج دیا ہے' جو اپنی جان اللہ کی راہ میں نچھاور کرنے کو عظیم ترین سعادت جانتے ہیں۔ اللہ کی شفقت و رحمت کے اصل مستحق تو ایسے ہی مخلص وفادار بندے ہیں جو اس کیفیت کے ساتھ اپنا تن من دھن اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے ہیں کہ

؎ "جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی - حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا")

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ لاہور

ندائے خلافت

جلد ۳ شمارہ ۳۹

۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

(19)

مدیر

اقتدار احمد

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات

تحریکِ خلافت پاکستان

۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقام اشاعت

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون : ۸۵۶۰۰۳

○

پبلشر : اقتدار احمد طابع : رشید احمد چودھری

مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

○

قیمت فی پرچہ : ۶/- روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۲۵/- روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ———— ۱۲ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ———— " " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ———— ۱ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ———— " " "

ادار یہ

تو آئے جو ڈالر !

اکابرینِ جماعت اسلامی میں سے حال ہی میں "سابق" ہوجانے والے ایک مولانا نے اس وقت جب وہ حلقۂ ادبِ اسلامی کی روحِ رواں تھے اور "جناب نعیم صدیقی" کہلاتے تھے' ہمارے اوّلین وزیرِاعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم کی پہلی امریکہ یاترا کے پیچھے فضا کو معطر کرتی ہوئی آتی ڈالروں کی خوشبو پاکر ایک طویل نظم کہی تھی جس کا عنوان وہی تھا جو اس اداریہ پر درج ہے۔ نوعمری میں پڑھی یہ نظم دل میں تو سما گئی تھی' یادداشت میں اب محفوظ نہیں لیکن اس کا مضمون حافظے پر نقش ہے۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے ان بلاؤں کی فہرست مرتب کی تھی جو ڈالر کے جلو میں آنے والی تھیں اور آخر میں اسے مخاطب کرکے بڑی ہی پرسوز اپیل کی تھی---- "ڈالر' مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا"۔ لیکن ڈالروں نے آنا تھا' آئے اور وہ سب کچھ ساتھ لائے جن کا دھڑکا نعیم صدیقی صاحب کو لگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ آیا' پونڈ سٹرلنگ کے ساتھ' ڈوش مارک کے ساتھ' فرنچ فرانک کے ساتھ' جاپانی ین کے ساتھ اور ریال و درہم و دینار کی زکوٰۃ و صدقات کے ساتھ بھی۔ پاکستان کو انہوں نے ناپاک کیا یا اب تک پاک ہی چھوڑ رکھا ہے' اس پر اپنی رائے کا اخفاء اسے فاش کردینے سے بہتر ہے۔

۸۰ء کی دہائی میں "امداد" کی پائپ لائن کا منہ پاکستان کے لئے ابتدائی برسوں میں تو بالکل ہی کھلا رکھا گیا اور رَو میں سب کچھ روا رہا لیکن آخری دنوں میں اس پر اولاً تنگ ٹونٹیاں لگائی گئیں اور بعدازاں انہیں بند ہی کر دیا گیا۔ نواز شریف صاحب نے وزیرِاعظم بنتے ہی "کشکول" کو توڑ پھینکا' گلے میں جھولی البتہ ڈال لی اور دامن بھی پھیلائے رکھا لیکن وہ بات کہاں مالوی مدن کی سی۔ ڈالروں کی بارش کے مقابلے میں اس کے بدلے ہوئے ناموں کی نپے تلے پیانوں میں بوندا باندی سے ہمارا حلق ہی تر رہ سکتا تھا۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم' بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔ پھر بے نظیر صاحبہ تشریف لائیں جن کے لئے اہداف اور لائحۂ عمل کا تعین یادش بخیر' ہمارے "امپورٹڈ" نگران وزیرِاعظم معین قریشی صاحب کر ہی گئے تھے۔ ان کی طرف سے عمل درامد کے بیچ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوئی' کوئی "بائل نیک" آگئی تو اسے دُور کرنے' عبور کرنے میں "خاموش سفارت کاری" کا گُر آزمایا گیا۔ بارے خدا خدا کرکے اب کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے اور سنتے ہیں کہ ڈالروں کے سیلاب کا بند بس ٹوٹنے ہی والا ہے۔ یہ ڈالر سرمایہ کاری کے راستے آئیں گے اور ظاہر ہے کہ سرمایہ کاری کی اولین شرط بنیادی سہولتوں یعنی "انفراسٹرکچر" کی موجودگی ہے۔ اس میدان میں خود کفالت کے حصول کی غرض سے پہلا قدم پی ٹی سی یعنی ملک کے مواصلاتی نظام کی ذمہ دار کارپوریشن کو "نج کاری" کی راہ دکھا کر اٹھایا جاچکا ہے۔ یہ عمل اتنا ہی "شفاف" ہے جتنا نواز شریف صاحب کی نج کاری اور موٹروے کی ٹھیکیداری شفاف تھی۔ منشا گروپ پہلے مبینہ طور پر نواز شریف صاحب کی "منشاء" کا نام تھا' اب اسی گروپ کی پی ٹی سی ودچروں کے سلسلے میں موجودہ حکمرانوں سے "تیری میری ایک مرضی" ہوئی بیان کی جاتی ہے۔

بنیادی سہولتوں میں مغرب سے آنے والے سرمایہ داروں' صنعتکاروں' فنی مشیروں اور ٹیکنالوجی کی منتقلی کے لئے تشریف لانے والے ماہروں کے مزاج سے موافقت رکھنے والا ماحول بھی شامل ہے۔ یہ لکھت پڑھت میں آنے والی شرط نہیں' ان روایات کی طرح مستحکم مفاہمت ہے جن کی بدولت برطانیہ کا سیاسی نظام الفاظ میں مقید کسی آئین کے بغیر بھی صدیوں سے میانہ روی کی چال چلتا آرہا ہے۔ ماحول کے ذکر سے ذہن ماحولیاتی آلودگیوں کی طرف جائے گا' جی ہاں ! انہیں صاف کرنا بھی ضروری ہوگا تاہم اہم ترین مسئلہ "اسلامی دقیانوسیت" اور "بنیاد پرستی" کی "آلودگی" سے فضائے پاک کو نجات دلانا ہے جس میں اصلی گوروں کا دم بھی گھٹتا ہے اور اپنے نقلی گوروں کو بھی سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی کیفیت "نقل مطابق اصل" سے بھی کچھ بڑھ کر دگرگوں ہے۔ چنانچہ آپ اور ہم دیکھ ہی رہے ہیں کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ آدھا سر ڈھانپ کر اور ہاتھ میں تسبیح تھام کر بھی اور مسلم وزرائے خارجہ کے اجلاس اسلام آباد کو مخاطب کرکے غیر مبہم الفاظ میں اس اعلان کے باوجود کہ یہ ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا اور اس کا تشخص اسلام ہے' ملک کی فضا سے وہ

سب اثرات بالکل محو کر دینا چاہتی ہیں جو اسلام کو بطور ایک دین کسی بھی درجے میں راس آسکیں۔ زبان سے کچھ بھی کہیں' ان کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ "جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے' مٹا دو"۔ پھر بڑے میاں سو بڑے میاں' چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ لطف یہ ہے کہ قائدِ حزبِ اختلاف' جناب نواز شریف بھی اب اسلام کا نام تک لینے کے روادار نہیں اور خدا بھی انہیں یاد نہیں آتا حالانکہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے ہیں۔ ان کے اصل مشیر جناب مشاہد حسین اور جناب اجمل خٹک جیسے مومنینِ صالحین ہیں جبکہ اسلام کا نام لینے والوں سے نمٹنے کے لئے وہ پروفیسر ساجد میر کے ہاتھ میں مولانا عبدالستار نیازی صاحب کا "عصائے پیری" تھما دینے کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ گویا حکومت ہو یا اپوزیشن' اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ان میں اختلاف مسلک و مذہب تک محدود ہے ورنہ دین دونوں کا کھرا اور کھنکتا ہوا سیکولرزم ہے۔

ان دونوں متحارب گروہوں میں اصل جھگڑا یہ ہے کہ ڈالروں کی بارش میں نہانے کا موقع پہلے کس کے ہاتھ آئے' ڈالروں کے آبِ رواں کا بہاؤ کس کی طرف ہو اور ڈالروں کے بحرِ بے کراں میں غوطہ لگا کر گوہرِ مراد کون نکال کر لائے۔ کشمیر اور ایٹمی توانائی کسی کا بھی مسئلہ نہیں اور پاکستان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارا بنانے کی امنگ و آرزو سے دونوں کے دل یکساں تہی ہیں۔ ڈالر کا جو سیلاب آ رہا ہے اس کے یہ دونوں فریق یکساں بے قراری سے منتظر ہیں۔ ان میں سے کسی کو یہ فکر نہیں کہ اس نظریاتی ریاست کی بنیادوں میں سیلاب بلا کا پانی مرے گا تو ملک خداداد پاکستان کا ڈھانچہ ہل کر رہ جائے گا۔ کوئی بھی اس غم میں دبلا نہیں ہو رہا کہ شعائرِ دینی کا حلیہ بگڑ جائے گا' مذہب رام کی لیلا بن کر رہ جائے گا اور مشرقی تہذیب و ثقافت کی وہ قدریں دم توڑ دیں گی جو پہلے ہی نزع کے عالم میں ہیں۔ ان میں سے کسی بھی ایک فریق کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر کے پاکستان کے مسلمان ایک جُوا کھیل رہے ہیں اور جُوا مسلمانوں کو کبھی راس نہیں آتا۔

محاذ آرائی کی شدت کا عالم اب یہ ہے کہ اس ملک کے ہر باسی کے لئے کسی ایک فریق کا ہو کر رہنا گویا ضروری ہو گیا ہے۔ غیر جانبداری زبان پر پائی بھی جائے تو دل کی بے ایمانی چھپائے نہیں چھپتی۔ نفاق آبادی کی اسفل سطح سے اعلیٰ ترین طبقات تک قلوب و اذہان میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے جس کی قرآنی سزا کا تصور کرتے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں' بیان کا یارا ہو تو کیسے!۔ سر جوڑ کر بیٹھنے اور کچھ سوچنے کا وقت بھی نکلا جا رہا ہے اور یہ کام کرے بھی تو کون؟۔ بظاہر تو کچھ کر گزرنے کا موقع بھی نظر نہیں آتا۔ پاکستان کی سیاست میں باہم متصادم دونوں گروہوں کے طلسمِ ہوشربا سے نکل سکنے کی ہمت جسے بھی میسر ہے' اُسے دعا کے ساتھ چارہ جُوئی بھی کرنی چاہئے لیکن کیا؟۔ اسی سوال کے جواب پر آئندہ کے لائحۂ عمل کا انحصار ہے۔ اگر یہ نظام ہی فاسد ہے تو اسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی جد و جہد کے لئے کسی اجتماعیت سے منسلک ہو جائیے وگرنہ آپ نے یہ سمجھا ہے کہ فلاں کے تخت کا تختہ ہو جائے اور فلاں کے سر پر اقتدار کا ہما آ بیٹھے تو بات بن جائے گی تو جائیے اور دیوار پر لکھا پڑھنے کی بجائے دیوار سے سر ہی ٹکرائیے۔OO

ابتدائے عشق ہے...

ایک اخباری اطلاع کے مطابق سعودی عرب سمیت چند خلیجی ریاستوں نے اسرائیل کے خلاف اقتصادی پابندیاں جزوی طور پر اٹھانے کا اعلان کردیا ہے۔ انہوں نے یہ اعلان نیویارک میں ایک اجلاس کے بعد کیا۔ اعلان میں کہا گیا ہے کہ وہ اسرائیل کے ساتھ کاروبار کرنے والی امریکی فرموں کو اپنی بلیک لسٹ سے خارج کردیں گی۔ امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے خلیجی ریاستوں کے اس اعلان کو اہم پیش رفت قرار دیا ہے۔ سعودی عرب کے علاوہ جن ریاستوں نے یہ پابندیاں ختم کرنے کا اعلان کیا' ان میں قطر' بحرین' کویت' اومان اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔

اردون اور مراکش تو اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات تک قائم کر چکے ہیں' یاسر عرفات غزہ کی پٹی اور مقبوضہ مغربی کنارے پر ایک بستی اریحہ میں بلدیاتی نوع کے اختیار حاصل کر کے ہی فرحاں و نازاں ہیں اور اب نوبت بہ ایں جا رسید کہ خلیج کی چھ ریاستوں نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے پیش خیمہ کے طور پر وہ قدغن بھی اٹھالی جو اب تک ان کی طرف سے اسرائیل کے خلاف واحد جارحانہ کارروائی تھی۔ عراق کو امریکہ اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں پٹوا کر عرب ممالک نے جو کارنامہ انجام دیا' یہ اسی کا

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

بقیہ: حدیثِ امروز

۱۹۴۷ء کے رمضان المبارک کی سعید ترین ساعت میں ایک نظریاتی ریاست نے پاکستان کا جغرافیائی نام اختیار کر کے جس منزل کی طرف سفر شروع کیا تھا' وہ تاحال تو ایک سراب ہی ثابت ہو رہی ہے۔ یہ گاڑی نشتم پشتم "قرارداد مقاصد" کے سٹاپ پر پہنچی تو کہنے والوں نے تو اسی وقت کہہ دیا تھا کہ "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے" لیکن وہاں اس کا پہیہ جام جو ہوا تو اب تک جام ہی چلا آتا ہے۔ پہیہ گھوم کر نہیں دیا' بعد کے عشروں میں دھکّے سے "اسلامی اقدامات" کے ان "کچّے سٹاپوں" تک اسے لایا ضرور گیا جو پلیٹ فارموں اور سگنلوں تک سے محروم ہیں "مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی" کیونکہ یہ ساری مشقت بھی آخر کار صفر سے ضرب کھاتی نظر آ رہی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اپنا پہیہ جام ہے لیکن وقت کا پہیہ اسی یکساں تیز رفتاری سے گھوم رہا ہے جو خالقِ زمان و مکاں کی جانب سے "کن فیکون" کے مرحلے میں ہی طے کر دی گئی تھی۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں اور ہم اپنے جی میں یہ ٹھانے بیٹھے ہیں کہ گھڑیال کی منادی ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیں گے یا پھر "پنڈولم" سے لٹک ہی جائیں گے کہ ہمارے بارہ ذرا بج کر تو دکھائیں!

حکومت سے عرض کریں یا اپوزیشن کے آگے ہاتھ جوڑیں' لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ عوام بھی اپنے آپ کو "کالا نعام" ثابت کرنے پر تُلے لگتے ہیں۔ لے دے کے ہوش مندوں کی اس اقلیت کو ہی وقت کی نزاکت کا احساس دلا سکتے ہیں جو "وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْن" (سورہ واقعہ) کے مصداق اب معاشرے میں خال خال نظر آتے ہیں کہ وقت کی تھوڑی سی مہلت ابھی شاید باقی ہے۔ اور ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی اسی بے پایاں رحمت کا تسلسل ہو گی جو اب تک پاکستان کے شاملِ حال رہی۔ اس سے فائدہ اٹھائیے اور اپنے بھائی بندوں کو وہ پیغام پہنچانے میں رات دن ایک کر دیجئے جو آپ تک پہنچ چکا ہے اور جو اس مسلمان قوم کے لئے فلاحِ دین و دنیا کی واحد نوید ہے۔OO

داعیٔ تحریک کے چوتھے خطبۂ خلافت کی آخری قسط

مرتبہ : نثار احمد ملک

اب دو طرفہ تصادم کی نوبت نہیں آئے گی

اسلامی انقلاب کے آخری مرحلہ کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے

اس انقلابی جدوجہد کا اگلہ مرحلہ تصادم ہے۔ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں یہ مرحلہ مسلح تصادم کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ اس مرحلہ کا آغاز حضور ﷺ کی طرف سے ہجرت کے بعد ہوا' مکہ والوں کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس مرحلہ میں دو طرفہ مسلح جنگ ہوئی۔ سورۂ توبہ کی آیت کا حوالہ پہلے بھی آچکا ہے' جہاں اسی بات کو واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا "ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ" یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون" کہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ گویا یہ دو طرفہ مسلح تصادم ہے' جس میں قتل کیا بھی ہے اور قتل ہوئے بھی ہیں۔

چنانچہ ہم سیرت طیبہ میں دیکھتے ہیں کہ بدر میں ستر قریشی مارے گئے جبکہ تیرہ صحابہ موقع پر شہید ہوئے اور چودھویں وہ ہیں جو شدید زخمی ہوئے اور مدینہ جاتے ہوئے راستے میں شہید ہوگئے۔ غزوۂ احد میں معاملہ بدر کے بالکل برعکس ہوگیا۔ اس غزوہ میں ستر صحابہ شہید ہوگئے۔ اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ عہد حاضر میں یہ تصادم کا مرحلہ کیسے آئے گا۔ جہاں تک تعلق ہے پہلے مرحلے کا تو اس کو جوں کا توں لے کر چلنا ہے۔ کسی تغیر و تبدل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ وہ مرحلہ یہ ہے کہ قرآن پڑھو اور پڑھاؤ' قرآن کی دعوت عام کرو۔ اسی قرآن کے ذریعے ایمان حاصل کرو اور اسے قلب و ذہن میں گہرے سے گہرا اتارتے جاؤ! دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے۔ اس مرحلہ میں صرف اتنا فرق واقع ہو جائے گا کہ بیعت کے الفاظ میں "فی المعروف" کا اضافہ ہو جائے گا۔ تیسرے مرحلہ کو ہم جوں کا توں نہیں لے سکتے' اس لئے کہ اس مرحلہ میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہو چکی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے اب اجتہاد کی ضرورت ہے۔

پہلی تبدیلی یہ واقع ہوئی ہے کہ اس وقت کے حالات اور آج کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوگیا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ حضور ﷺ نے ۶۲۲ء میں ہجرت مدینہ کی ہے۔ اس لحاظ سے اب ۱۳۷۱ برس بیت چکے ہیں۔ حضور ﷺ کے عہد مبارک کے حالات اور آج کے حالات میں جو فرق واقع ہوا ہے اس کا ادراک ضروری ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر حالات میں فرق نہ ہو تو اجتہاد کی قطعاً ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں حضور ﷺ کے منہج کی جوں کی توں پیروی کرنی ہوگی۔

اس حوالے سے جہاں تک میں نے غور کیا ہے' دو تبدیلیاں منفی اعتبار سے ہوئی ہیں جبکہ ایک تبدیلی مثبت اعتبار سے واقع ہوئی ہے۔ ان دونوں تبدیلیوں سے ایک نتیجہ نکلے گا جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ ایک منفی تبدیلی یہ ہوئی کہ حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا واسطہ کھلے کافروں سے تھا جبکہ آج اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے والے مسلمان ہیں۔ نظام خلافت کے برپا ہونے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی مسلمان ہیں۔ اس وقت مصر میں حسنی مبارک مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح شام میں اخوان کے ساتھ جو کچھ حافظ الاسد کر رہا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اب یہ کہنے کو تو مسلمان ہی ہیں۔ الجزائر میں اسلامی تحریک کو کچلنے والے فوجی بھی مسلمان ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں نظام مصطفیٰ کی تحریک پر گولیاں چلانے والے بھی مسلمان تھے۔ گویا حالات میں یہ بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ نظام خلافت برپا کرنے کے لئے پہلے ان نام نہاد مسلمانوں سے نمٹ لینا پڑے گی' اس کے بعد کہیں جا کر معاملہ کفار کے ساتھ ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لینی چاہئے کہ فلسطین میں اسرائیل نے P-L-O کے ساتھ مصالحت ہی اس لئے کی ہے کہ مسلمان' مسلمان کو قتل کرے۔ جب مسلمان ایک دوسرے کو قتل کریں گے تو یہودیوں کو قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے کہ جب یہود قتل کریں گے تو ان کے قتل ہونے کا بھی امکان موجود ہے۔ یہودیوں نے اسی لئے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ انہیں چھوٹی سی حکومت محدود خود مختاری کے ساتھ بنا دو' اس کے بعد یاسر عرفات مسلمانوں کے ساتھ وہی کچھ کرے گا جو کچھ حسنی مبارک کر رہا ہے!

حضور ﷺ کے عہد مبارک اور ہمارے دور میں ایک اور تبدیلی یہ واقع ہوگئی کہ آپؐ کے عہد مبارک میں کوئی باقاعدہ حکومت اور Standing Army نہیں تھی۔ گویا معاملہ انسانوں کا انسانوں سے' تلواروں کا تلواروں سے' نیزوں کا نیزوں سے' گھوڑوں کا گھوڑوں سے اور اونٹوں کا اونٹوں سے تھا۔ یہاں اگر کوئی فرق ہے تو وہ تعداد کا ہے۔ آپ لوگ نفری کے فرق کے ساتھ ساتھ اسلحہ کے فرق کا اضافہ بھی کریں تو یہ زیادہ سے زیادہ ایک اور سو کی نسبت بنے گی! ظاہر ہے کہ یہ نسبت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگیا ہے۔ اس وقت جو نظام سرمایہ دارانہ' جاگیردارانہ اور ملوکیت پر مبنی موجود ہیں' ان نظاموں کے ساتھ ان نظاموں کو چلانے والوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ وہ ان نظاموں سے مراعات حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے ان مفادات کی حفاظت کے لئے Standing Armies موجود ہیں۔ یہ Standing Armies پیرا ملٹری فورس' پولیس اور ایئر فورس پر مشتمل ہیں۔ باغیوں کو کچلنے کے لئے ایئر فورس کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اپنے ملک میں صوبہ بلوچستان میں ایئر فورس استعمال ہوئی۔

اسی طرح حافظ الاسد نے ایئرفورس کے ذریعے "حمص" شہر کو تہس نہس کر دیا تھا جو کہ "الاخوان المسلمون" کا مرکز بن گیا تھا۔ لہٰذا ان دو منفی تبدیلیوں کی وجہ سے مقابلہ بہت ہی غیر مساویانہ ہو گیا ہے۔

مذکورہ بالا دو منفی تبدیلیوں کے علاوہ ایک مثبت تبدیلی بھی ہوئی ہے۔ وہ مثبت تبدیلی یہ ہے کہ رسالت مآب کے ایک ہزار سال بعد تک ابھی انسان کا عمرانی شعور اس سطح تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ ریاست اور حکومت میں فرق کر سکے۔ آج انسان کا عمرانی شعور یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ وہ ریاست کو الگ شے سمجھتا ہے اور حکومت کو ریاست کا ایک عنصر سمجھتا ہے۔ حکومت دراصل ریاستی امور چلانے کا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ شہریوں کی وفاداری ریاست کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے نہ کہ حکومت کے ساتھ' حکومت کو بدلنا شہریوں کا حق ہے۔ اس حوالے سے عظیم فرق و تفاوت پیدا ہو چکا۔ اس فرق و تفاوت کا ادراک بہت ہی ضروری ہے۔

عمرانی ارتقاء سے پیدا ہونے والے اس فرق کو اگر سامنے رکھا جائے تو اب مسلح تصادم کے مرحلہ کا متبادل بھی موجود ہے۔ یہاں اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ میں مسلح بغاوت کو حرام ہرگز نہیں سمجھتا۔ اس ضمن میں امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ موجود ہے کہ یہ جائز ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کے لئے کڑی شرائط عائد کی ہیں۔ ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ طاقت اتنی ہو جائے کہ کامیابی یقینی نظر آنے لگے۔ ان کی یہ شرط بحالات موجودہ مشکل ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہو جائے تو جائز ہے۔ مختلف ممالک کے حالات میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی پہاڑی ملک ہے تو وہاں گوریلا جنگ کامیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے حالات کسی ایسی گوریلا جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اس وقت ہمیں اپنے ملکی حالات پر غور کرنا ہے۔ پاکستان کے حوالے سے یہ چیز تقریباً محال ہو چکی ہے۔ اس بات کو میں پھر دہرا رہا ہوں کہ مسلح بغاوت حرام نہیں ہے بلکہ عملاً محال ہے۔ اس وقت دنیا میں حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ انتخابات کا ہے۔ آپ ووٹ کی طاقت سے حکومت تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے حوالے سے ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں کہ اس کے ذریعے چہرے تو تبدیل کئے جا سکتے ہیں' نظام ہرگز نہیں بدلا جا سکتا۔ ہمیں چہرے تبدیل نہیں کرنے بلکہ نظام بدلنا ہے۔ انتخابات کے انعقاد کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جو بھی نظام موجود ہے اس کو اچھے طریقے سے چلایا جا سکے۔ دوسرا طریقہ ایجی ٹیشن کا ہے۔ اس طریقے سے کامیابی تب ممکن ہے کہ تیاری مکمل ہو۔ اگر لاکھوں افراد سر پر کفن باندھ کر نکلنے کے لئے تیار ہوں تو کامیابی یقینی ہے۔ اسے ہم مظاہراتی طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک مظاہرہ تو وہ ہے کہ جسے ہم "خاموش مظاہرہ" کہتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری دعوت و تبلیغ کا ایک طریقہ ہے۔ نظام بدلنے کے لئے جو مظاہرہ ہوتا ہے' اس کے ذریعے باطل نظام کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ یہ مظاہرہ گھیراؤ کے ساتھ ہو گا کہ اس نظام کو اب نہیں چلنے دیں گے! اسی کا ایک حصہ ترکِ موالات کی تحریک بھی ہو گی۔ یعنی اب اس باطل نظام کو ٹیکس نہیں دیں گے' بینکوں کو نہیں چلنے دیں گے اور جاگیردار کو اس کا حصہ نہیں دیں گے۔

کوئی انقلابی تحریک جب اس مرحلے میں داخل ہو جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل نظام اس کے راستے میں مزاحم ہو گا۔ اب وہ اس جماعت کے کارکنوں پر گولیاں برسائیں گے اور جیلوں میں ٹھونسیں گے۔ لیکن یہ یک طرفہ جنگ ہو گی' دو طرفہ نہیں ہو گی۔ اس لئے میں نے کہا ہے کہ سیرت النبی میں یہ مسلح جنگ دو طرفہ تھی۔ لیکن یہاں کسی کو قتل نہیں کریں گے بلکہ قتل ہونے کے لئے تیار ہو کر میدان میں آئیں گے۔ یہ بات ایک سے زیادہ مرتبہ دہرائی جا چکی ہے کہ نظام خون دیئے بغیر نہیں بدلے گا۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین بھی غالب ہو جائے اور ایک قطرہ خون بھی نہ بہے تو یہ، ماری خام خیالی ہے۔ اگر یہ کام خون دیئے بغیر ہو سکتا تو حضور ﷺ کئی سو صحابہ کی جانوں کا نذرانہ پیش نہ کرتے۔ جبکہ ہمارا یقین ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی جان بھی ہم جیسے لاکھوں انسانوں کی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ جیسے رفقاء کی قربانیاں دی ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے اسد اللہ واسد رسولہ کا خطاب عطا فرمایا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینے میں پہنچنے والے پہلے معلم قرآن ہیں۔ انہی کی محنت سے مدینہ میں انقلاب آیا تھا۔

اب میں آپ کے سامنے نہی عن المنکر کے حوالے سے وہ حدیث مبارکہ رکھ رہا ہوں' جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح مسلم شریف کی روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان" یعنی "جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے۔ اس پر دلی کرب محسوس کرے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" گویا اگر یہ نفرت بھی نہیں تو ایمان ہی نہیں ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک طاقت نہیں "نہی عن المنکر باللسان" کا فریضہ جاری رہے گا۔ ہم زبان سے کہتے رہیں گے کہ یہ حرام ہے' یہ جاگیرداری ہے' یہ سود ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب طاقت ہو جائے گی تو اب نظام باطل کو میدان میں چیلنج کیا جائے گا۔ یہی مضمون ایک دوسری حدیث مبارکہ میں زیادہ واضح ہو کر آیا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ بھی صحیح مسلم کی روایت ہے اور اس کے راوی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ وسلم نے فرمایا:

"مامن نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی الا کان لہ فی امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ ثم انما تخلف من بعد ھم خلوف یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یومرون فمن جاھد ھم بیدہ فھو مومن ومن جاھد ھم بلسانہ فھو مومن ومن جاھد ھم بقلبہ فھو مومن ولیس وراء ذٰلک من الایمان حبۃ خردل"

اس حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ "مجھ سے پہلے اللہ نے جس نبی کو اس کی اپنی امت میں مبعوث فرمایا تو اس نبی کی امت میں اس کے ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو اپنے نبی کی سنت کو تھامے رکھتے تھے اور اس کے حکم کی اطاعت کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آجاتے تھے جو نالائق ہوتے تھے۔ جو کہتے تھے اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور ایسے کام کرتے تھے کہ جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا تو ایسے لوگوں سے جو شخص ہاتھ یعنی قوت وطاقت سے جہاد کرے تو وہ مومن ہے۔ اور جو شخص زبان سے

جہاد کرے تو وہ مومن ہے اور جو شخص دل سے جہاد کرے یعنی دل میں کڑھے' تو وہ بھی مومن ہے۔ اور اگر ان تینوں حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

مذکورہ بالا حدیث بہت ہی جامع ہے۔ امتوں کے زوال کا پورا فلسفہ دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قول و فعل کا تضاد امتوں کو زوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ ایک طرف عشق رسول کا دعویٰ ہے لیکن اتباع رسول کا ان کی زندگی میں کوئی گزر ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بدعات و رسومات کا ایک طومار ہے کہ جو دین بن کر رہ گیا ہے۔

انقلابی جدوجہد کے تمام مراحل کو بیان کر دینے کے بعد مجھے دو باتیں مزید کہنی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ یہ اس کے ایمان کا عین تقاضا ہے ورنہ وہ مذکورہ حدیث کے مطابق قول و فعل کے تضاد کا شکار تکلب ہو رہا ہے۔ اس کا دعویٰ تو اللہ پر ایمان کا ہے جبکہ اللہ کا دین پامال ہو رہا ہے اور وہ اپنے کاروبار چمکانے میں مشغول ہے۔ اس وقت دین جس قدر مغلوب ہے' اس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالیؒ ۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

مولانا حالی مناجات بحضور ختم المرسلین میں فرماتے ہیں کہ۔

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

ایک طرف دین کی پستی کا یہ عالم ہے' دوسری طرف ہماری بے غیرتی اور بے حمیتی یہ ہے کہ بس اپنے کاروبار' اپنی جائیداد اور معاملات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں فکر ہے تو اپنی کاروں کے ماڈل اور ٹیلی ویژن کے سکرین کے سائز کی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دین کے غلبہ کی جدوجہد فرض عین ہے۔ اس میں ایک نکتہ کا اضافہ بھی کروں گا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں' وہیں یہ جدوجہد فرض ہے۔ ایک مسلمان بھی کہیں ہے تو اس کا فرض ہے کہ دین کے غلبہ کی جدوجہد کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ ساڑھے نو سو برس کی زندگی دے' تب بھی یہی کام کرتا رہے۔ یہ کام تب بھی کرنا ہے جب کوئی مانے اور تب بھی کرنا ہے جب کوئی ایک شخص بھی نہ مانے۔ قرآن نے ہمارے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کی مثال رکھی ہے۔ وہ اللہ کا بندہ ساڑھے نو سو برس استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑا رہا ہے۔ ان کی اس ساڑھے نو سو برس کی محنت سے کتنے لوگ ایمان لائے؟ اگر وہ کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے تو وہ ناکام ہو جاتے۔ وہ کام کرتے رہے' قوم نہیں مانی تو اب قوم ناکام ہو گئی لیکن وہ کامیاب ہو گئے۔

یہ بات کہ اگر کہیں ایک مسلمان ہے تو اس پر بھی دعوت دین و اقامت دین فرض ہے' سیرۃ مطہرہ کے مطالعہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے جب کام کا آغاز کیا تو تنہا تھے۔ ہمارے لئے اسوۂ کاملہ حضور ﷺ ہیں۔ اس لئے کہ قرآن نے کہا ہے کہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" البتہ ایک بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ جو کام آپ نے بیس برس کی مختصر مدت میں کیا ہے' اب شاید وہ کئی سو برس میں مکمل ہو۔ بقول اقبال۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کام کو برعظیم پاک و ہند میں جاری ہوئے تقریباً چار سو سال ہو چکے ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اس کام کا آغاز حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا ہے۔ ان کے بعد دعوت قرآنی کا آغاز حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ سے ہوا ہے۔ اس کے بعد پچھلی صدی میں جہاد و قتال کا نمونہ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے دکھا دیا۔ یہ سارا کام تدریجاً ایک نکتے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بات میں بارہا دہرا چکا ہوں کہ مشیت ایزدی میں اس خطے کی کوئی خاص اہمیت ضرور ہے۔ اس لئے کہ ایک ہزار برس تک تمام مجددین امت عالم عرب میں پیدا ہوئے۔ جیسے ہی الف ثانی شروع ہوا تو مجددیت کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہو گیا۔ گیارہویں صدی کے مجدد شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں' جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ جو بارہویں صدی کے مجدد ہیں' پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب مجدد علوم اسلامی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے امت مسلمہ کو قرآن کی طرف متوجہ کیا ہے۔ امت مسلمہ کی قرآن سے بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ اسے صرف حصول ثواب کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریک کا اثر ہے کہ پچھلے تین سو سالوں میں قرآن حکیم پر سب سے زیادہ علمی و فکری کام برعظیم پاک و ہند میں ہی ہوا ہے۔ باقی پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ کام اب تدریجاً ہو گا۔ اس وقت بیسویں صدی میں یہ کام ایک بھرپور اور جامع تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ بیسویں صدی کے حوالے سے یہ کام اب تیسری نسل میں ہو رہا ہے۔ اس کام کو یہاں تک پہنچنے میں بہت سے لوگوں کی محنت شامل ہے۔ بقول غالب

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

آج سے اٹھاسی برس قبل ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ حکومت الٰہیہ کے قیام کا نعرہ لے کر اس ملک میں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بیعت کی بنیاد پر حزب اللہ قائم کی تھی۔ الہلال اور البلاغ کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا غلغلہ مچا دیا تھا۔ اس کے علاوہ نوجوان مبلغینِ قرآنؒ پیدا کرنے کے لئے کلکتہ میں دارالارشاد کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا' تاکہ فکر قرآنی کو عام کیا جا سکے۔ گویا برعظیم پاک ہند میں بھی یہ جدوجہد کم از کم اسی برس پرانی ہو کر اب تیسری نسل میں داخل ہو چکی ہے۔ جو کام حضور ﷺ نے ایک Life span میں کر دیا تھا' وہ اب اگر تین چار نسلوں میں مکمل ہو جائے تب بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جس کام کا آغاز ۱۹۱۲ء میں کیا تھا وہ اس کو جاری نہ رکھ سکے۔ ان کی اس بددلی کے کئی اسباب تھے' جن میں سے ایک قدامت

پسند — علماء کی مخالفت بھی تھا۔ انہوں نے اس کام کو چھوڑ کر اپنی توانائیاں جہادِ حریت میں کھپانی شروع کردیں۔ اس کے لئے انہوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار کرلی۔ یہ بات میں نے بارہا کہی ہے کہ مجھے اس ابوالکلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام سے ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جس کام کو چھوڑا دیا تھا' اس کا بیڑا دوبارہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اٹھایا۔ مولانا آزاد مرحوم نے حزب اللہ قائم کی تھی جبکہ مولانا مودودی مرحوم نے جماعت اسلامی کی داغ بیل ڈالی' اگرچہ ان سے یہ کوتاہی ہوگئی کہ اس کی بنیاد بیعت کے نظام پر نہ رکھی۔ مولانا آزاد نے ایک ادارہ "دارالارشاد" کے نام سے قائم کیا تھا جبکہ مولانا مودودی مرحوم نے علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند کے ذریعے "دارالسلام" بنایا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اپنے اصل کام کو سات' آٹھ سال ہی جاری رکھ سے' جبکہ مولانا مودودی مرحوم بھی جماعت اسلامی قائم کرنے کے بعد اپنے اصولی انقلابی طریقہ کار پر سات آٹھ سال ہی کاربند رہ سکے۔ پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی کو انتخابی سیاست میں الجھادیا۔ اس طرح وہ ایک قومی سیاسی جماعت بن کر رہ گئی۔ انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس جانے کے بعد جماعت اسلامی کا انقلابی کردار ختم ہوکر رہ گیا ہے۔

جہاں سے مولانا مودودی مرحوم نے کام چھوڑا تھا' اب تیسری نسل میں' میں نے اس کام کا آغاز کیا ہے۔ حضور ﷺ کے الفاظ میں "استدار الزمان کھیئتہ یومًا خلق اللہ السموات والارض" کہ آج زمانہ چکر کھاکر پھر اسی مقام پر آگیا ہے' جہاں سے اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت اس کی تقویم مقرر کی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت دعوت قرآنی کے عام کرنے میں لگایا ہے۔ گویا یہ دعوت رجوع الی القرآن ہے۔ نوجوانوں میں قرآن کے پڑھنے اور پڑھانے کا جذبہ پیدا کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ اس کے لئے انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا' اسی انجمن کے تحت قرآن اکیڈمیوں اور قرآن کالج کا قیام عمل میں آیا۔ قرآن اکیڈمیوں میں دو سالہ اور ایک سالہ کورسز کے ذریعے ایسے نوجوان تیار کئے گئے جو اس قرآنی فکر کو عام کر سکیں۔ اس کے علاوہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام قرآنی کانفرنسیں' قرآنی تربیت گاہیں اور محاضرات قرآنی کا انعقاد مختلف شہروں میں ہر سال ہو رہا ہے۔ بقول اقبال۔

دشت تو دشت ہیں' دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

میں تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس پیغام کو نجانے کہاں کہاں لے کر پھرا ہوں۔ اس سارے پس منظر کو اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ کام آج ہم نے شروع نہیں کیا بلکہ یہ ایک مسلسل عمل کا حصہ ہے۔ دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا تھا' وہی کام مختلف نسلوں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ہمارے اس کام کے تین حصے ہیں۔ یہ بات میں نص قرآنی کے حوالے سے عرض کروں گا۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا گیا کہ " الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء" درخت کی ایک جڑ ہوتی ہے' اس کا ایک تنا ہوتا ہے اور پھر شاخیں ہوتی ہیں جو پھیل جاتی ہیں۔ اسی طرح درخت کی مثال حدیث مبارکہ میں بھی آئی۔ یہ حدیث مبارکہ حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ اے معاذ! اگر چاہو تو اس دین کے اونچے عملوں میں جو چوٹی کا عمل ہے اور جو اس کی جڑ ہے' وہ تمہیں بتادوں؟ انہوں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان! ضرور ارشاد فرمایئے! آپ نے فرمایا کہ جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ اس کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں' محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور جس عمل سے دین کی گرفت مضبوط رہتی ہے' وہ نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اس کے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ہمارے اس کام کی جڑ اور بنیاد دعوت رجوع الی القرآن ہے' جسے میں نے انقلابی جدوجہد کے پہلے مرحلے "دعوتِ ایمان بذریعہ قرآن" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے لئے انجمن خدام القرآن قائم ہے۔ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں قرآن اکیڈمیوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ ان اکیڈمیوں میں ایک سالہ کورس اور دو سالہ کورس کے ذریعے وہ نوجوان پیدا کئے جارہے ہیں جو قرآن کو براہ راست پڑھ اور سمجھ سکیں۔ بقول اقبال۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قرآن حکیم کو تفسیروں اور ترجموں سے نہیں بلکہ براہ راست سمجھا جائے۔ گویا کہ قرآن آپ کے قلب پر نازل ہو رہا ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی عرض کروں گا کہ وہ لوگ کہ جنہوں نے دنیوی علوم و فنون حاصل کرلئے ہیں' لیکن اتنی عربی زبان نہیں سیکھی کہ قرآن حکیم کو براہ راست سمجھ سکتے' وہ سوچ لیں کہ اللہ کے حضور کیا جواب دیں گے۔ حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق "حاسبوا انفسکم من قبل ان تحاسبوا" یعنی آج اپنا محاسبہ کرلو' قبل اس کے کہ آپ کا محاسبہ کیا جائے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

دوسرا کام ہم یہ کر رہے ہیں کہ تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کے دل نور قرآنی سے روشن ہوجائیں' اب وہ اقامت دین کی جدوجہد کے لئے تنظیم اسلامی میں شمولیت کریں۔ تنظیم اسلامی سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت پر قائم ہے۔ اقدام کا مرحلہ جب بھی آئے گا' وہ تنظیم کے تحت ہی ہوگا' اس لئے کہ جب تک وہ لوگ نہ جمع ہوجائیں جو اپنے اوپر اور اپنے دائرہ اختیار میں دین کا نفاذ کرچکے ہوں اور مل جل کر بنیانِ مرصوص بن چکے ہوں' اقدام نہیں ہوسکتا۔ اس تنظیم کی حیثیت درخت کے تنے کی سی ہے۔ درخت کی جڑوں کی مانند تحریک رجوع الی القرآن ہے۔ درخت کو ساری غذا جڑوں سے آرہی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی' اسلامی' انقلابی جماعت بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ جماعت ہم بنا چکے ہیں۔ بحالات موجودہ ایسی جماعت بنانا بہت مشکل ہے' کیونکہ ہمارے اذہان انگریز کی غلامی کے اثرات سے ابھی آزاد نہیں ہوئے۔ ہماری غیرت و حمیت کچلی جاچکی ہے۔ ہمارے اخلاق کا دیوالیہ نکل چکا ہے' ہم لوگ وعدہ کرکے بھول جاتے ہیں۔ ان حالات میں بیعت سمع و طاعت کی بنیاد پر جماعت بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ہمارے اس کام کی تیسری سطح یہ ہے کہ نظام خلافت کے اجتماعی ڈھانچے اور اس کی برکات کو عام کیا جائے۔ یہ کام ہم تحریک خلافت پاکستان کے ذریعے کر رہے ہیں۔ یہ دراصل عوام کو Educate کرنے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

محمد سمیع

ایک متنازع تحریر کے بارے میں آخری وضاحت

ہم نے تو اس سلسلے میں اپنی معروضات گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں پیش کرکے گویا قصہ کو تاہ کردیا تھا لیکن مضمون نگار' ہمارے رفیق کار اور قلمی معاون محمد سمیع صاحب بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور "ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے" کی قلمی تصویر بھی ہیں۔ ان کا نقطہ نظر پڑھیئے اور ہمارا ان سے یہ اختلاف نوٹ کرلیجئے کہ ہمیں "جادلھم بالتی ھی احسن" کے ربانی حکم پر تو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا....(مدیر)

جب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان محمد نسیم الدین صاحب نے میرے اس مضمون کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جو ندائے خلافت کے شمارہ نمبر ۱۵ میں شائع ہوا' مجھ سے کہا کہ اس پر شدید رد عمل ہوا ہے تو حیرت ہوئی۔ کیا میں اور کیا میرا مضمون؟ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ! بہرحال جب شمارہ نمبر ۱۶ میں "ایک گستاخی اور اس پر گرفت" کے عنوان سے بھائی اقتدار احمد کا نوٹ پڑھا تو خیال گزرا کہ مجھ سے شاید کوئی گستاخی واقعی سرزد ہو گئی ہے ورنہ مدیر ندائے خلافت کی اپنی جانب سے معذرت پیش کرنے کی نوبت نہ آتی۔

کچھ نہ کچھ لکھنے کا خبط مجھے اسکول کے زمانہ سے ہی رہا ہے اور یاد پڑتا ہے کہ میرے ایک مضمون پر جو ڈھاکہ سے شائع ہونے والے روزنامہ "پاسبان" میں ۶۰ء کی کسی تاریخ میں شائع ہوا تھا' مجھے خاندان کے بزرگوں کی سرزنش کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ مضمون میں افسانوی انداز میں انہی کے ان رویوں کا ذکر تھا جو انہوں نے میرے والد مرحوم کی وفات کے بعد میرے ساتھ روا رکھا تھا۔ اب کے میری تحریر پر براہ راست تو میری کوئی سرزنش نہیں ہوئی البتہ "بھلے گھوڑے کو ایک چابک ۔ بھلے مانس کو ایک بات" کے مصداق مجھے اپنی لغزش کا احساس ہوا ہے۔ مدیر "ندائے خلافت" نے تو کسی لیپا پوتی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے البتہ میرا حق ہے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ عرض کروں۔

میں تاحال اپنے آپ کو اس میدان میں مبتدی ہی سمجھتا ہوں اور مدیر ندائے خلافت کا خود پر یہ احسان مانتا ہوں کہ وہ میرے مضامین کو اپنے رسالے میں جگہ دیکر میری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "من آنم کہ من دانم" میں کیا اور میرے مضامین کیا۔ غالب نے کہا تھا کہ "صدیوں سے ہے پیشہ آباء سپہ گری' کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ "صدیوں سے ہے پیشہ آباء جفاکشی' مضموں نویسی ذریعہ عزت نہیں مجھے"۔ بہرحال جب بھائی اقتدار احمد صاحب نے معذرت کرلی ہے تو مجھے بھی عافیت معذرت کرنے ہی میں نظر آتی ہے۔ کیونکہ بزرگوں کا اصرار ہے کہ "مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات" لہٰذا "تاب لاتے ہی بنے گی غالب۔ معاملہ سخت ہے اور جان عزیز"۔

جب میرے دو تایازاد بھائیوں کا نکاح ہو رہا تھا تو پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہماری برادری شیخ صدیقی ہے۔ اس موقعہ پر ہمارے تایا نے پہلی مرتبہ اپنا نام صفدر حسین کی بجائے شیخ صفدر حسین صدیقی اور اپنے بیٹوں کا نام شیخ انور حسین صدیقی اور شیخ منظر حسین صدیقی نکاح ناموں میں درج کروایا تھا۔ نمعلوم ہم لوگ اپنے نام کے ساتھ صدیقی کیوں نہیں لکھتے؟۔ بہرحال میں نے اپنی پرانی خاندانی روایت کو قائم رکھا تو محض اس لئے کہ کہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقام و مرتبہ اور کہاں ہم جیسے ننگ اسلاف کی ان سے نسبت۔ "کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ"۔ بہرحال اصحاب رسول ﷺ و رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کسی بھی کم سے کم درجے میں اپنی نسبت مستحضر نہ رہے تو کسی داعی تحریک اسلامی کے لئے اس کے رفیق کار کے دل میں محبت کا جذبہ بھی موجزن نہ ہو؟۔ اور داعی تحریک سے بے پناہ محبت کسی بھی اسلامی تحریک کی کامیابی کے لئے شرط لازم کا درجہ رکھتی ہے۔ ذرا ذہن میں وہ واقعہ لائیں کہ حدیبیہ میں صلح سے پہلے جب عروہ بن مسعود ثقفی نے جو کفار کی نمائندگی کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ سے گفتگو کے لئے آیا تھا' دوران گفتگو یہ گستاخانہ انداز اختیار کیا کہ بار بار نبی اکرم ﷺ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتا رہا۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ آپ ﷺ کے ساتھیوں کا اس پر رد عمل کیا ہے؟ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بحیثیت محافظ وہاں کھڑے تھے' انہوں نے عروہ کی بار بار کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی تلوار کا دستہ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا کہ آئندہ یہ ہاتھ حضور ﷺ کی ریش مبارک تک بڑھا تو قطع ہو جائے گا۔ واپس نہیں جاسکے گا۔ اگر ہماری محبت کے تیور اپنے امیر کے ساتھ صحابہ کرامؓ سے کسی بھی درجے میں ملتے جلتے نہ ہوں جو وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رکھتے تھے تو ہمارا یہ دعوی کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لئے کھڑے ہوئے ہیں' محض ایک زبانی کلامی بات تو ہو سکتی ہے حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہو گا۔

اگر میں نے پروفیسر غفور صاحب کے لئے اپنے مضمون میں "بھائی غفورے" کا طرز تخاطب اختیار کیا ہے تو اس کی وجہ بھی اس مضمون میں بیان کردی ہے۔ اس سے ان کی تضحیک ہرگز مقصود نہیں تھی۔ اگر ہم میں مزاح کی حس ہی ختم ہو جائے تو یہ اور بات ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانے میں میں جماعت اسلامی کا امیدوار رکن تک رہ چکا ہوں اور اس وقت وہ میری جماعت کے مرکزی نائب امیر کا درجہ رکھتے تھے جن کے جلسہ ہائے عام میں میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔

ہمارے ایک بھائی فرمانے لگے "بھائی سمیع آپ یہ بھول گئے کہ آپ یہ فکاہی کالم کسی عام اخبار کے لئے نہیں لکھ رہے بلکہ ندائے خلافت کے لئے لکھ رہے ہیں جو دین کے علمبرداروں کا نمائندہ رسالہ ہے"

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

محترم بھائی اقتدار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ' ——— مزاج گرامی!

آپ نے پروفیسر غفور صاحب کے بارے میں "ندائے خلافت" میں میرا مضمون کیا شائع کر دیا' لاہور سے کراچی تک ایک ہی شور ہے۔ دو ڑو پکڑو اس گستاخ کو۔ بچ کر جانے نہ پائے!۔

تحریکی زندگی کا موجودہ رخ اختیار کرنے کے بعد میں نے اپنے قلم کی محنت کو بھی دین کی جانب پھیر دیا ہے اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ مختلف و متنوع انداز میں مقصد ایک ہی ہو اور وہ ہو دین کی خدمت۔ لکھاری تو ہوں نہیں ایک مبتدی سے غلطیاں سرزد ہونی بھی ناممکن نہیں لیکن اس قدر شور کی تاب نہ لا سکا۔ قلم پھر چل پڑا' جو لکھا حاضر ہے۔ امید تو نہیں ہے کہ اب کے آپ اسے شائع کریں گے۔

والسلام

دعاؤں کا طالب۔ محمد سمیع

عدلیہ کے وقار کا قافیہ کب سے تنگ ہو رہا ہے؟

سردار اعوان

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

"نجکاری" کو حدود و قیود سے آزاد رکھنے میں پوشیدہ مصلحت

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ۔ (یہ نعرہ آج بھی بعض مقامات پر جلی حروف میں لکھا نظر آتا ہے) اسی طرح اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے حقیقی قیام سے ہی یہ ملک باقی رہ سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر یہاں اسلام نہیں آیا تو یہ ملک اپنا جواز کھو بیٹھے گا۔ لیکن یہ ہماری حقائق سے چشم پوشی کی عادت ہے یا خوش فہمی پر مبنی آرزوؤں کا اثر کہ حالات کتنے ہی دگرگوں کیوں نہ نظر آرہے ہوں اور ہمارے اپنے کرتوتوں کے باعث ملک تباہی کے کیسے ہی خوفناک دہانے تک کیوں نہ پہنچ گیا ہو' کوئی شخص پاکستان کے خاتمے کے الفاظ سننے کے لئے تیار نہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا' جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے فقط ہمیں جھنجھوڑنے اور حالات کی سنگینی کا احساس دلانے کے لئے پاکستان کے خاتمے کا اندیشہ ظاہر کیا تو ایک اہم قومی اخبار نے آسمان سر پر اٹھالیا' حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ ایسی کوئی انہونی بات نہیں۔ پوری کائنات جب فانی ہے تو اس کی کوئی شے ابدی کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن انسانی نفسیات کو یہ گوارا نہیں کہ اپنے خاتمہ کا گمان کرے۔ (اور اگر کہیں بھی بس نہ چلے تو مرنے والے کو "شہید" کا لقب دے کر "زندہ" کر لیا جاتا ہے) حالانکہ دیکھا جائے تو ۱۹۴۷ء میں جو پاکستان وجود میں آیا تھا وہ تو ۱۹۷۱ء میں ختم ہو گیا تھا۔

بہرحال ایسا ہی ہے تو چلئے اس "منحوس" لفظ کا اپنے اوپر اطلاق نہیں کرتے' دوسروں کو "مردہ" کہنے میں تو کوئی قباحت نہیں' لہٰذا یہ دیکھتے ہیں کہ کسی ملک کے خاتمے سے ہماری مراد کیا ہے؟ سب سے نمایاں مثال سوئیت یونین کی ہے مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ سوئیت یونین میں کیا "ختم" ہو گیا ہے۔ وہاں انسان باقی نہیں رہے یا زمین کہیں نیچے دھنس گئی ہے' یا وہاں کا مال و اسباب کسی دوسری قوم نے چھین کر انہیں فاقوں سے مرنے پر مجبور کر دیا ہے؟ بظاہر کوئی بھی ایسی بات نہیں۔ بلکہ ہوا یہ ہے کہ عالمی دنیا میں سوئیت یونین کا سپرپاور ہونا باقی نہیں رہا۔ جس قومی نظریئے کا وہ علمبردار تھا اس سے دست بردار ہو کر اس نے مخالف نظریئے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ ایک مخصوص گروہ مسلسل وہاں سیاہ و سپید کا مالک بنا رہا جس نے دھوکے اور جبر سے عوام کو ایک عضو معطل بنائے رکھا اور جب دیکھا کہ کشتی ڈوبنے والی ہے تو اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کنارہ کش ہو گیا۔

اس لحاظ سے اگر اپنے ملک کا جائزہ لیا جائے تو شاید ہی کوئی فرق نظر آئے۔ معلوم ہوتا ہے ایک بھی قومی ادارہ ایسا نہیں ہے' جو حکمرانوں کی دست برد سے محفوظ رہا ہو۔ چنانچہ خاتمے کے لفظ سے بدکنے کی بجائے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس ملک کو صحیح بنیادوں پر نئے سرے سے استوار کرنے کے لئے میدان میں اتریں۔

ہم اس وقت تباہی کے جس دہانے پر کھڑے ہیں' وہاں حادثاتی طور پر نہیں آ گئے' بلکہ "نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں" کے مصداق قدم بہ قدم چل کر یہاں آئے ہیں۔ گویا قومی سطح پر درجہ بدرجہ تنزلی ہمارا معمول بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے اس کے کہ حالات پر نادم ہوں یا کوئی تشویش محسوس کریں۔ ہم پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس کھیل میں منہمک نظر آرہے ہیں اور اسے اس کی منطقی انتہا تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہیں۔

چند روز قبل شائع ہونے والی دو تحریروں کے بعض حصے یہاں دوبارہ نقل کرنے کا اصل مدعا یہ ہے کہ کوئی صاحب علم و عرفان انہیں دیکھ کر ہماری رہنمائی فرمادیں کہ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ جو لوگ کچھ کرنے کے قابل باقی رہ گئے ہیں وہ ان طالع آزما سیاستدانوں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر مشتمل مفاد پرست حکمران ٹولے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور ان سے "نجات" حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کریں۔

ان میں سے پہلی تحریر کا موضوع "نجکاری" ہے جو ایک حالیہ اختراع ہے مگر اس میں جو "پھرتیاں" دکھائی جا رہی ہیں وہ لمحہ فکریہ ہیں۔ دوسری تحریر کا عنوان ہے: "کیا قوانین عدالت کا قانون منسوخ ہو چکا ہے؟" اسے پہلی مرتبہ عوامی سطح پر روشناس کرانے کا سہرا تو "جیالوں" کے سر ہے جنہوں نے نواز حکومت کے حق میں عدالتی فیصلہ کا استقبال "چمک" اور "کوئے شاہ" جیسے نعروں سے کیا' مگر ماہنامہ ساحل کراچی (ستمبر ۹۴ء) کا طویل اداریہ' جس کے چند اقتباسات یہاں درج کئے جا رہے ہیں' پڑھ کر محسوس ہوا کہ یہ تو بڑا پرانا مرض ہے۔ معزز اداریہ نگار کا یہ سوال بہت اہم ہے کہ "اگر اعلیٰ عدالتیں خود ناانصافی کا ارتکاب کریں تو ان سے جواب طلبی کون کرے؟"

"نج کاری کے بارے میں صاحب مضمون رقم طراز ہیں:" چنانچہ حال ہی میں اس گروپ نے حکومت کے اس فیصلے کی زبردست مذمت کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محترمہ بے نظیر کی حکومت صوبہ سندھ میں موضع قاضی پور جو سکھر کے قریب ہے' میں واقع گیس کے کنوؤں کو فروخت کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ قاضی پور کے ان گیس کے کنوؤں سے ۴ ہزار سے ۶ ہزار بیلن یعنی ۴ ہزار سے ۶ ہزار ارب مکعب فٹ گیس موجود ہے' سرکاری حلقوں کا کہنا ہے کہ حکومت اس بیش بہا دولت کو ایک ہزار ارب روپے میں فروخت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو کہ ماہرین کے نزدیک سونے کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرنے والا معاملہ ہے اور سب دولت بیرونی کمپنی کے

ہاتھ فروخت کی جانے والی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ قاضی پور کے ان کنوؤں سے گیس نکلنے کا جو تخمینہ لگایا گیا وہ بلوچستان میں سوئی کے مقام سے نکلنے والی گیس سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر یہ سودا طے پا گیا تو اپنی نوعیت کا یہ بے نظیر حکومت کا پہلا سودا ہو گا جو ایک حساس ترین شعبے میں طے پائے گا کیونکہ اب تک ہماری گھریلو ضرورتوں کے لئے فقط بلوچستان سوئی گیس ہی ہے جس سے ہم ۱۹۵۲ء سے استفادہ کر رہے ہیں۔ نواز شریف حکومت نے بہت سے قومی ملکیت میں لئے گئے اداروں کو نجی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کیا لیکن اس حکومت کو ایسی حساس صنعت کو نجی ہاتھوں اور بالخصوص بیرونی سرمایہ کاروں کے ہاتھ منتقل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی' اس ضمن میں سب سے لطف کی بات یہ ہے کہ قاضی پور کے گیس کے ان کنوؤں کی فروخت کا کام نج کاری کمیشن کے ذریعے سے نہیں کیا جارہا۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی پاکستانی صنعت کار یا سرمایہ دار کو بھی گیس کے ان کنوؤں کی خریداری کے عمل میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی' چنانچہ جو بھی بیرونی کمپنی یہ کنویں خریدے گی اس کو براہ راست گیس نکالنے اور فروخت کرنے کی اجازت ہوگی۔ بہرحال ابھی تک حکومت نے ان کنوؤں کی فروختگی کی تمام تفاصیل طے نہیں کیں لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اتنا ضرور کہہ دیا ہے "کہ مجھے یہ کنویں جس طریقے سے فروخت کئے جارہے ہیں اس پر پورا اعتماد ہے" لیکن جہاں تک ماہرین کا تعلق ہے وہ گیس کے ان کنوؤں کی فروختگی کے سخت مخالف ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ جہاں تک تیل اور گیس کا تعلق ہے اس میں سب سے مشکل' مہنگا اور جان لیوا کام تو یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ یہ تیل اور گیس کس مقام پر موجود ہے' ایک دفعہ اس مشکل کو عبور کرلیا جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ تیل اور گیس کس مقام پر ہے تو پھر بقول امان اللہ لون کے یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی نے سونے کی کان کا مقام معلوم کرلیا' یہ امان اللہ لون سوئی ناردرن گیس کمپنی کے سابق جنرل منیجر ہیں جو اب پنشن پر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تیل اور گیس کی ترقیاتی کارپوریشن نے ابتدائی معلومات حاصل کرلی ہیں اور ان پر پاکستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی کو صرف کیا جاچکا ہے اور یہ معلوم کرلیا گیا ہے کہ یہ قیمتی گیس کہاں ہے تو پھر اس کا پھل کھانے کا حق بھی پاکستانی عوام ہی کو ہے نہ کہ کسی بیرونی کمپنی کو یہ حق منتقل کردیا جائے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کا کہنا ہے کہ بیرونی بین الاقوامی تیل کمپنیوں کے مخصوص مفادات ہوتے ہیں ان کو تیل اور گیس کے نئے کنویں تلاش کرنے میں دلچسپی نہیں ہوتی' مثال کے طور پر سوئی ناردرن گیس کمپنی جس کی کنٹرولنگ کمپنی پاکستان پٹرولیم لمیٹڈ ہے جو ایک پبلک کمپنی ہے لیکن اس کے ۵۱ فیصد برما آئیل کمپنی کی ملکیت ہیں' یہ برما آئل کمپنی یکے از بین الاقوامی تیل کمپنی ہے جو دنیا کے کئی ممالک میں تیل کو کنٹرول کرتی ہے چنانچہ جب پچاس کی دہائی کے آغاز میں سوئی کے مقام پر گیس دریافت ہوا تو اس کے بعد برما شیل نے التزاماً مزید کنویں دریافت کرنے سے اجتناب کیا تاکہ اس کی اجارہ داری رہے اور من مانی قیمتیں وصول ہوتی رہیں۔ چنانچہ مزید کنوؤں کی دریافت اس وقت شروع ہوئی جب خود حکومت پاکستان نے اس ضمن میں قدم اٹھایا۔ چنانچہ ایوب حکومت کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو نے جب وہ پٹرولیم کے وزیر تھے تو انہوں نے ہی سوویت یونین سے تیل کی تلاش کے سلسلے میں سمجھوتہ کرکے اس اجارہ داری اور جمود کو توڑا تھا اور یہی ایک قدم تھا جس نے ان کو امریکہ کے غیظ و غضب کا شکار بنادیا اور ایوب کے وزیر خزانہ شعیب سے ان کی ان بن اسی اقدام سے ہوئی تھی۔"

"تو اس کا مطلب کیا ہوا کہ حکومت اس امر کی اہل نہیں رہی کہ وہ ان اداروں کو چلا سکے جب حکومت اپنی اس نااہلی کو تسلیم کرتی ہے خواہ یہ نواز شریف کی حکومت ہو یا بے نظیر کی ایک بات تو ہے کہ وہ اداروں کو حکومت کے کنٹرول میں رکھنے کا یارا نہیں رکھتے جب حکومتیں اپنی اس بے بسی کا یہاں تک اعتراف کر رہی ہوں تو پھر یہ حکومتیں کس منہ سے نظام کو بچانے کا نام لیتی ہیں' کس نظام کو' جو نظام نہ بجلی مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے' نہ تعلیم کی' نہ صحت کی' نہ مکان مہیا کرنے کی' تو پھر آج کون سا نظام ہے جس کو بچانے کی دہائی دی جاتی ہے۔

تعلیم کو لیجئے اس کی پوری ذمہ داری اب نجی ہاتھوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے' چنانچہ اگر کوئی ادارہ اس تعلیم کی مد میں اعداد و شمار اکٹھے کرے تو معلوم ہوگا کہ اب سرکاری سکولوں میں طلبا کی تعداد کم ہے بمقابلہ نجی اداروں کے زیر انتظام چلنے والے مدارس کے' ان میں اچھے مدارس بھی ہیں اور استحصال کرنے والے مدارس بھی ہیں۔ اسی طرح جس بڑے پیمانے پر نجی شعبے میں ہسپتال' کلینک کھل رہے ہیں اس سے بھی جہاں آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہاں غریبوں کے لئے مشکلات لاانداز پیدا ہو گئی ہیں۔"

(نوائے وقت' ۲۰ ستمبر ۹۴ء)

اور اب عدلیہ کے بارے میں "ماہنامہ ساحل" کے طویل اداریہ سے چند اقتباسات: "سعد سعود جان کے بارے میں فتویٰ باز مولویوں نے شور مچایا کہ وہ قادیانی ہیں۔ ان کی جانب سے تردیدی بیانات آتے رہے وہ خود بھی چیف جسٹس بننے میں دلچسپی رکھتے تھے لہٰذا عملی تردید کے لئے وہ ایک مسجد میں نماز ادا کرنے گئے اس سے بھی تشفی نہ ہوئی تو نماز کے بعد مسجد کی تعمیر و تزئین کے لئے ایک لاکھ روپے چندہ بھی دیا۔ یہ طرز عمل اتنے اہم ترین منصب کے خواہش مند فرد کی شان کے صریحاً منافی تھا۔"

"یاد رہے کہ سعد سعود جان وہ صاحب ہیں جنہیں جونیجو دور حکومت میں پنجاب ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کے ایک عزیز دوست آفتاب فرخ جنہیں پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کے جرم میں لاہور ہائیکورٹ سے الگ ہونا پڑا تھا جونیجو مرحوم سے قربت کا خاص تعلق رکھتے تھے۔ غوث علی شاہ سے بھی ان کا یارانہ تھا۔ آفتاب فرخ کو جونیجو نے بلاکر سعد سعود جان کے بارے میں رائے دریافت کی ان کی دیانت اور لیاقت کی تعریف سنی تو کہا ان کو ٹٹول کر دیکھتے ہمارے لئے مسائل تو پیدا نہیں کریں گے۔ آفتاب فرخ اس کو عدالتی آداب کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی خاموش ہو گئے۔ سعد سعود جان سے ملے اور باتوں باتوں میں اس واقعہ کو بے حد محتاط الفاظ دے دیئے۔ جان صاحب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دو ٹوک کہا میں کسی سے کوئی کومٹ منٹ نہیں کرسکتا دستور اور قانون کے مطابق اپنے فرائض ادا کروں گا۔ جونیجو کو مثبت جواب نہ ملا تو جسٹس غلام مجدد مرزا کو سپریم کورٹ کا جج بنا کر لاہور ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس مقرر کردیا۔ وکلاء نے اس پر رٹ دائر کی تو یہ فیصلہ واپس لے کر نیا چیف جسٹس مقرر کردیا۔ (جنگ ۲ جولائی ۹۴ء)"

"جونیجو جیسے مرنجاں مرنج اور کمزور وزیر اعظم کی عدلیہ کے بارے میں یہ سوچ ہو تو دوسرے وزراء اعظم کے عزائم کا اندازہ آسان ہو جاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جسٹس آفتاب فرخ جیسے اصولی شخص نے یہ بات سن کر سعد سعود جان تک پہنچا بھی دی۔ اگر سعد سعود جان واقعی اتنے کھردرے سے

اصولی تھے تو ان کا فرض تھا کہ وہ جونیجو اور آفتاب فرخ کو توہین عدالت کے الزام میں سزا سنا دیتے' مگر مسجدوں کو چندے دے کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے والے جج سے ایسی جرأت کا ارتکاب مشکل ہے۔"

"جسٹس سجاد علی شاہ نے عہدہ سنبھالنے کے بعد جون کے مہینہ میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے دو ملاقاتیں کیں۔ یہ ملاقاتیں وزیراعظم ہاؤس میں ہوئیں' جس نے معترضین کو تنقید کے مزید مواقع مہیا کئے۔ اگر یہ ملاقاتیں وزیر اعظم خود چیف جسٹس کے چیمبر میں کرتیں تو ان کی نوعیت الگ ہوتی۔ یہ ملاقاتیں چیف جسٹس کے مرتبے کے منافی تھیں۔ ضیاء الحق کے زمانے میں جب جسٹس یعقوب علی خان چیف جسٹس تھے تو ضیاء الحق کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ انہیں ایوان صدر طلب کرتے۔ ایک معاملہ میں گفتگو کے لئے وہ خود جسٹس کے دفتر گئے اور وہاں ملاقات کی۔ جج کا وقار' اعتبار اور افتخار اسی میں ہے کہ وہ انتظامیہ سے فاصلے پر رہے' مگر تاریخ خط سفر بدل چکی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چیف جسٹس نے بی بی سی اور وائس آف جرمنی کو باقاعدہ انٹرویو دیتے ہوئے عدالتوں میں ججوں کی تقرری کے اختلافی مسئلے پر رائے ظاہر کی اور اسے آئین کے مطابق قرار دیا۔"
(جنگ ۱۷/اگست ۹۴ء)

"کئی برس پہلے "پرائیویٹ آئی" کے ٹائٹل پر ایک خاتون وکیل اور موجودہ وزیر اعظم کی تصاویر شائع ہوئی تھیں' جس کے نیچے سرخی تھی "پاکستان کے اسلامی معاشرے کی نمائندہ خواتین۔" اگر میگزین دستیاب ہو تو اس خاتون وکیل کو شناخت کرنا کوئی مشکل نہ ہوگا کہ وہ آج کس مقام پر ہیں۔ اسی طرح سے ایک خاتون وکیل اور لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج کی دوستی کے بارے میں لوگ جتنا کچھ جانتے ہیں اور جس طرح انہوں نے ہائی کورٹ کے کیفے ٹیریا میں اس خاتون وکیل کو مردوں کی اس نشست میں بارہا گھس کر بیٹھے دیکھا' جہاں موصوف رونق افروز ہوتے تھے۔ اس خاتون وکیل کو نئے بلند مقام پر دیکھ کر لوگوں نے اپنے دانتوں میں انگلیاں دابی۔ ایک اور خاتون وکیل ماہر امراض دماغی کے زیر علاج بھی رہیں۔ ہائی کورٹ کے یہ جج صاحبان کورٹ کے بار روم میں پہنچے تو انہیں یہ نعرہ سننا پڑا۔ "Save Judiciary to Save Pakistan"

"صوبہ سندھ میں ایک اور نئی روایت قائم کی گئی۔ گورنر سندھ محمود ہارون کی بیرون ملک روانگی کے بعد روایتاً چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ کو گورنر کا حلف اٹھانا چاہئے تھا مگر پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کے اسپیکر غوث بخش مہر نے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ (جنگ ۲۸ جولائی ۹۴) اس روایت کا پس منظر یہ ہے کہ جسٹس عبدالحفیظ میمن کے گورنر بننے کی صورت میں ہائی کورٹ کے سینئر جج چیف جسٹس بن جاتے۔ ان دنوں قائم مقام چیف جسٹس کی تقرری کے خلاف درخواست زیر سماعت تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ درخواست عجلت میں نمٹادی جاتی اس خطرے سے بچنے کے لئے سال ہا سال کی روایت جو قانون کا درجہ اختیار کر چکی' اسے پامال کر دیا گیا۔ اگست ۸۹ء میں جب بے نظیر حکومت کو برطرف کیا گیا تو سندھ ہائیکورٹ میں اس اقدام کو چیلنج کر دیا گیا۔ اس وقت جسٹس سجاد علی شاہ چیف جسٹس تھے حکومت کو خدشہ تھا کہ سجاد علی شاہ اسمبلی کو بحال نہ کردیں اور درخواست کی تیز رفتار سماعت نہ کریں۔ لہٰذا اس کا حل یہ نکالا گیا کہ گورنر محمود ہارون کو سعودی عرب بھیج کر وہاں علیل کرا دیا گیا۔ مقدمے کی سماعت ہوتی رہی اور فیصلہ صدر کے حق میں ہوا۔ فیصلے کی رات ہی گورنر سندھ صحت یاب ہو کر وطن واپس لوٹ آئے اس وقت اسپیکر سندھ اسمبلی عبدالرزاق اور ڈپٹی اسپیکر عطا محمد مری موجود تھے مگر ان کو گورنر نہیں بنایا گیا۔ یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ عدالتوں پر حکومت کی گرفت دن بدن مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔"

"وفاقی وزیر قانون اقبال حیدر "نواز شریف نے اپنے دور میں اتفاق فاؤنڈریز کے قانونی مشیر کو جج بنایا۔ مسلم لیگ کے ایک صدر کو جج بنایا۔ پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے چیف جسٹس کو برطرف کردیا۔ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا تبادلہ بغیر کسی ریفرنس کے کردیا اور چیف جسٹس کو تبادلے کا علم ریڈیو اور ٹی وی سے ہوا۔ ایک چیف جسٹس کو اسلامی یونیورسٹی کا ڈائریکٹر بنادیا۔ ایک اور چیف جسٹس کو کرکٹ بورڈ کا صدر بنادیا۔ اس پر یہ دونوں اس قدر ممنون احسان ہوئے کہ عدلیہ کی روایات کے برعکس سیاسی بیانات دیتے رہے۔ نواز شریف نے کہا کہ مسلم لیگ کے کارکن اپنے مقدمات نو منتخب ججوں کی عدالتوں میں دائر نہ کریں۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ باقی تمام جج حضرات پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی پارٹی کے کارکنوں کے مقدمات ان ہی ججوں کے پاس لے جائیں۔ یہ بات عدلیہ کی توہین کے مترادف ہے۔"
(جسارت ۹/اگست ۹۴)

"نواب کالا باغ جاوید اقبال کو وزیر قانون بنانا چاہتے تھے۔ جاوید نے اس کا ذکر ایوب خان سے کیا۔ ایوب خان نے جاوید اقبال سے کہا میں نے اس قسم کی کوئی تجویز نہیں دی۔ میں حیران ہوں نواب کالا باغ نے آپ کو کس طرح پیش کش کی کیونکہ ہمیں تو (Rascals) کی تلاش ہے' تم تو ماشاء اللہ اپ رائٹ قسم کے آدمی ہو' تمہیں کون وزیر بنا سکتا ہے۔ (راسکل کے معنی بدمعاش غنڈا دغاباز) (کتاب "یادیں" تنویر ظہور مطبوعہ لاہور)

"جس روز جسٹس نسیم حسن شاہ اور انکے رفقاء نے نواز حکومت کی بحالی کا فیصلہ سنایا اس فیصلے سے چند لمحے قبل تک سب کو یقین تھا کہ پیکج ڈیل کے ذریعے تمام معاملات طے ہو چکے ہیں۔ جسٹس نسیم شاہ کی سفارش پر ان کی مرضی کے ایک جج کی سپریم کورٹ بینچ میں شمولیت اور ان کے بھتیجے کو بنک کا چیئرمین بنوانے کے بعد روئداد خان کا اعتماد کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ فیصلہ سنائے جانے سے صرف بیس منٹ پہلے یعنی تین بجے تک وزیر اعظم سیکریٹریٹ میں بطور وزیر اعظم بلخ شیر مزاری انتہائی مطمئن بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اس اعتماد کا اظہار کیا کہ تھوڑی دیر میں سپریم کورٹ کا فیصلہ آجائے گا اس کے بعد حکومت پورے یقین کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کرسکے گی۔ میں نے کہا نواز شریف اور ان کے رفقاء تو کھلے بندوں فیصلہ کرنے والے ججوں کی تعداد کا اعلان کر رہے ہیں مگر میر صاحب نے کہا سہیل بھائی چھوڑیئے یہ سب ان لوگوں کی ڈس انفارمیشن ہے مگر چند ہی لمحوں میں جب یہ فیصلہ آیا تو میری بات درست ثابت ہوئی۔ پھر جب سرسری سماعت کی خصوصی عدالتوں کے بعض جج حضرات کو میاں شہباز شریف کی ذاتی سفارش پر تمام ضابطے نظرانداز کرکے ہائیکورٹ کا جج بنایا گیا تو بھی کسی طرف سے کوئی آواز نہیں بلند ہوئی حالانکہ یہ لوگ سیشن جج بھی نہ تھے۔ لون کمیشن کی رپورٹ تو یاد ہوگی اور وہ یہ تو نہ بھولے ہوں گے کہ کوآپریٹو کے ذریعے غریبوں یتیموں کا مال کھا جانے والوں کے ننگے چہرے کو شرافت کی نقاب کس ادارہ کے وابستگان نے فراہم کی۔" (اظہر سہیل جنگ کراچی ۲۱ جولائی ۹۴ء)

"یہ تمام وہ دلخراش کہانیاں ہیں جو اخبارات میں

شائع ہوچکی ہیں۔کیا ان کہانیوں کو پڑھ لینے کے بعد عدالتوں کے احترام کی توقع لوگوں سے کی جاسکتی ہے۔ یہ تمام تحریریں عدالت عالیہ و عظمیٰ کی نظر سے گزری ہیں۔ ان پر توہین عدالت کی کارروائی کیوں نہیں ہوئی۔ کیا توہین عدالت کا قانون منسوخ کردیا گیا ہے یا عدالت ان حقائق کا سامنا کرنے سے گریزاں ہے۔ کیا یہ گریز عدالت کی ذلت و رسوائی کو عظمت جلالت اور جبروت عطا کر سکتا ہے؟ اگر یہ سب کچھ جھوٹ ہے تو ان مجرموں کے خلاف کیا کارروائی ہوئی جو عدالتوں کی ردائے عصمت تار تار کرچکے ہیں۔"

"ہمیں بہرحال اس طرح کا تاثر دیا جاتا رہا کہ آپ جو مرضی چاہے فیصلہ کریں ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے۔ ان دنوں اخبارات میں ایک پریس نوٹ بھی چھپ گیا تھا کہ فوج نے فلاں تاریخوں کو الیکشن کرانے کا فیصلہ کرلیا ہے، پھر تردید آگئی لیکن جو ان کے ہمنوا تھے انہوں نے ہم سے کہا ڈان پڑھ لیا ہے؟ جو پہلے صفحے پر چھپا ہے وہ دیکھ لیا ہے تو گویا براہ راست دباؤ نہیں لیکن بلواسطہ اشارے مل رہے تھے کہ ہوتا ہواتا کچھ نہیں اپنی مٹی مت پلید کرو وغیرہ وغیرہ۔"

اسلم بیگ کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی ہوئی تو عدالت خود مذاق بن گئی۔ لاکھوں لوگوں پر توہین عدالت کا مقدمہ قائم کرنا عملاً ممکن نہیں۔ آدھی قوم کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت توہین پر اتر آئے تو عدالت کو دیکھنا ہوتا ہے کہ کیا کرے ایکشن لے یا نظر انداز کردے۔" (تکبیر ۴/ اگست ۹۴ء)

"گزشتہ ہفتے لاہور ہائیکورٹ کے ایک جج جو وفاقی وزیر خارجہ آصف احمد علی کے کزن ہیں اور لاہور ہائی کورٹ کے ایک سابق چیف جسٹس کے صاحبزادے بھی ہیں، انہوں فیصل ٹاؤن لاہور کے ایک بنگلہ میں میاں نواز شریف سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا دورانیہ گھنٹوں میں تھا۔ شنید ہے کہ ملاقات میں خاصے وعدے وعید ہوئے۔ اس ملاقات کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ نواز شریف کے تقریباً تمام کیس مذکورہ جج ہی کی عدالت میں زیر سماعت ہیں۔ مذکورہ جج کے والد جب چیف جسٹس تھے تو ہائی کورٹ کے کسی جج کی تصویر اخبار میں دیکھ لی۔ اگلے ہی روز نوٹس بھجوایا گیا کہ آپ کو سوشل ہونے کا دورہ پڑگیا ہے تو آپ ہائی کورٹ سے مستعفی ہوجائیں۔ اب تو حالت اس قدر دگرگوں ہے کہ ہمارے جج حضرات سماجی تقریبات میں پوز بنا کر تصویریں بناتے ہیں اور دوسرے دن صحیح تصویر نہ آنے پر مذکورہ فوٹوگرافر کی پوری خبر لیتے ہیں۔" (منصف مزاج، ہفت روزہ ایشیاء لاہور ۳ جولائی ۹۴ء)

"کراچی بار ایسوسی ایشن اور سندھ بار ایسوسی ایشن نے مطالبہ کیا ہے کہ عدلیہ میں مبینہ سیاسی تقرریاں فوری طور پر واپس لی جائیں اور نئی تقرریاں اہلیت اور غیر سیاسی بنیادوں پر کی جائیں۔ ایک اور قرارداد میں لاہور اور سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان کی تقرری پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ سیاسی بنیادوں پر ججوں کی تقرری کے خلاف وکلاء کا جلوس سٹی کورٹ سے گورنر ہاؤس تک نکالا جائے گا ایم ایم پیرزادہ ایڈووکیٹ نے کہا کہ اس قسم کی قرارداد توہین عدالت کے مترادف ہے جبکہ دوسرے وکلاء نے قرارداد کو آئین کے مطابق قرار دیا۔" (جنگ کراچی ۱۸/ اگست ۹۴ء کراچی)

"اگر یہ تمام بیانات توہین عدالت ہیں تو صدر مملکت فاروق خان لغاری ۳۰ مارچ ۱۹۹۴ء کو لاہور میں ایوانِ عدل کا افتتاح کرتے ہوئے خود توہین عدالت کا ارتکاب کرچکے ہیں۔ انہوں نے تقریر میں کہا "عدلیہ کے نظام کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے ہر شہری تشویش میں مبتلا ہے اور اگر عدلیہ عوامی مشکلات کے ازالے میں ناکام رہی تو معاشرے کی تباہی ناگزیر ہے۔ عام آدمی آج بھی محسوس کرتا ہے کہ انصاف کی فراہمی میں تاخیر ہو رہی ہے اور یہ تاخیر انصاف نہ دینے کے مترادف ہے۔عوام حصول انصاف کے لئے رشوت دینے پر مجبور ہیں۔" (۳۱ مارچ جنگ کراچی ۹۴ء)

"ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق، غلام اسحاق خان، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے سیاسی مصلحتوں کی خاطر پاکستان کے عدالتی نظام کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے اور اس کے ازالے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ ساحل نے جون ۹۲ء میں لکھا تھا "پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سیاسی بنیادوں پر دھڑلے کے ساتھ ججوں کی تقرریاں کی جارہی ہیں۔ اس صورتحال کا تقاضہ یہ ہے کہ انصاف فراہم کرنے والے اداروں کی انصاف کے ساتھ تقرریاں کی جائیں۔"

"جون ۹۳ء میں ساحل نے لکھا کہ نواز شریف کیس کا فیصلہ نئی تاریخ ہے مگر عدالت عظمیٰ کا ایک سجدۂ سہو چالیس سال کے اعمال کا کفارہ نہیں بن سکتا۔ ابھی عدالت عالیہ کی قباء پر بہت سے داغ دھبے باقی ہیں اب بھی وقت ہے کہ عدالت عظمیٰ اپنے اعمال کا خود جائزہ لے، اپنا احتساب کرے اور عدالت کی حرمت سے کھیلنے والے تمام قومی مجرموں کے خلاف مقدمات کی سماعت کرے۔ ان مجرموں کی فہرست بہت طویل ہے مگر قوم غلام محمد، ایوب خان، یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق، شریف الدین پیرزادہ، اے کے بروہی، جسٹس انوار الحق، جسٹس عبدالحلیم، جسٹس مولوی مشتاق حسین، اسلم ریاض حسین، جنرل ممتاز رانا، جنرل مٹھا، جنرل کے ایم عارف، جنرل رحیم الدین خان، جسٹس ایس اے نصرت، راؤ رشید کو معاف نہیں کرسکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ججوں کے خلاف بھی کارروائی ضروری ہے جنہوں نے سیاسی بنیادوں پر تقررنامے حاصل کئے اور سیاسی وابستگی کی بنیاد پر جج بن کر سیاسی فیصلے دیئے۔ نواز شریف کا اولین فرض یہی ہے کہ جس عدالت سے انہیں انصاف ملا ہے اس عدالت کی عظمت قائم کرنے کے لئے ماضی کی تمام عدالتی ناانصافیوں کے خاتمے کے لئے قانون سازی کریں اگر آج وزیر اعظم عدالتوں کے ججوں کو تحفظات نہیں دیں گے تو کل ان کو دوبارہ عدالتی تحفظ ملنا غیر یقینی ہوگا۔"

"ہمیں دکھ ہے کہ ہمارا تجربہ سو فیصد درست ثابت ہوا ہے۔ پاکستان کے عدالتی نظام میں کوئی ابوحنیفہ نہیں جو منصب عدالت سنبھالنے سے انکار کردے اور یہ کہہ دے کہ میں اس منصب کا اہل نہیں ہوں۔ انتہا یہ ہے کہ پاکستان کے پہلے چیف جسٹس سر عبدالرشید جیسی جرأت سے بھی ہماری عدلیہ محروم ہے، جنہوں نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی خواہشِ ملاقات اس لئے نامنظور کردی تھی کہ ان کے پاس وفاقی حکومت کا مقدمہ زیر سماعت تھا اور وہ وزیر اعظم کی درخواست کے باوجود اپنے گھر یا دفتر میں وزیر اعظم سے ملاقات کے روادار نہ تھے۔"

(بشکریہ ماہنامہ ساحل کراچی ستمبر ۱۹۹۴ء)

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی پاکستان کی تازہ ترین تالیف

"برعظیم پاک و ہند میں
اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل
اور اس سے انحراف کی راہیں"

سفید کاغذ، دبیز کور--- قیمت ۳۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

مکتوب کراچی

نجیب صدیقی

اہلِ کراچی کو کس بات کی سزا دی جا رہی ہے؟

سب کر رہے ہیں آہ و بُکا' سب مزے میں ہیں

انسان اپنے گرد و پیش میں ہونے والے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ واقعات جب تسلسل اختیار کر لیں تو بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی صورت آج کل کراچی کی ہے۔ روزانہ درجنوں قتل ہو رہے ہیں جب کہ زخمیوں کی تعداد کا تو شمار ہی نہیں۔ قتل ہونے والے کس جرم میں قتل ہو رہے ہیں' انہیں یہ بھی معلوم نہیں۔ نیز کون قتل کر رہا ہے یہ عقدہ بھی آج تک لاینحل ہے۔ عموماً گاڑی قریب سے گزرتی ہے اور گولیوں کی بارش کرتے ہوئے چلی جاتی ہے' بوڑھے' بچے' جوان بھی ان کی زد میں آگیا زندگی سے ہاتھ دھو گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ اہل کراچی کو کس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔ کوئی شخص اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا خواہ وہ سڑک پر چل رہا ہو یا بازار میں خریداری کر رہا ہو' گھر پر ہو یا مسجد میں ہو' کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔

حالات کا تجزیہ کرنے والے اپنا دامن بچا کر لکھتے ہیں۔ حق بات کو چبا چبا کر بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی شدت کم ہو جائے اور وہ کسی گرفت میں نہ آجائیں۔ جن لوگوں کے قلم کی قیمت لگ چکی ہے انہیں ساون کے اندھے کی طرح ہر سمت ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے اور جو لوگ کچھ بے باک ہیں اور حق بات کو نوک قلم تک لے آتے ہیں' انہیں اخبار والے اپنے صفحات میں جگہ نہیں دیتے۔ آزادیٔ صحافت کے علمبردار بھی آزادی کے ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہیں۔ ظلم کو ظلم کہنے والے منقار زیر پر ہو چکے ہیں۔ ملک کے صدر اور وزیر اعظم نے اس طرف سے آنکھیں بند کر لیں ہیں' وہ غیر ملکی دوروں کے ذریعہ استحکام اور خوش حالی لا رہے ہیں۔ سندھ کی انتظامیہ کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک وزیر با تدبیر کا بیان شائع ہوا ہے کہ یہ دو گروہوں کے آپس کی لڑائی ہے۔ یعنی انتظامیہ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس نقطۂ نظر کو ذرا وسیع کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈکیتیاں بھی سرمایہ داروں اور محروم طبقے کے درمیان کی جنگ ہے' انتظامیہ کو اس سے کیا۔

کچھ نقاب پوش اسلحہ لئے مستقل گشت کرتے رہتے ہیں' پولیس اور دوسرے فورسز ان سے کس کے اشارے پر چشم پوشی کرتی ہیں' روزانہ کاروں سے فائرنگ کرنے والے بے گناہوں کی جانوں سے کھیل رہے ہیں اور پھر وہ گرفتار نہیں ہوتے' ان سوالوں کے جواب میں ہی مسئلہ کا حل ہے۔ وزیر صاحب کا جواب آپ نے سن لیا یہ کس بات کی طرف اشارہ ہے۔ پھر اس شہر کو کس سمت میں دھکیلا جا رہا ہے' یہ ساری آفتیں اسی شہر پر کیوں ہیں؟ کوئی اگر یہ کہے کہ "ندائے خلافت" کے صفحات مرثیہ نگاری کے لئے نہیں ہیں' لیکن حقائق کا سامنا کئے بغیر اور ان واقعات سے لاتعلق ہو کر موجودہ اذہان کو مطمئن نہیں کیا سکتا۔ جب تک آپ ان کے دکھ کو اپنا دکھ نہیں سمجھتے' آپ اپنی بات ان کے دل میں کیسے اتار سکتے ہیں۔ ایک بہت بڑا طبقہ خوف و گھٹن کی فضا میں سانس لے رہا ہے' سسکیاں بھر رہا ہے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھے بغیر انہیں اپنی بات نہیں سنا سکتے۔ مسلم امہ کبھی ایک امت ہوا کرتی تھی جب کہ آج تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار ہے۔ اب لوگ صوبوں کے حوالوں سے پہچانے جاتے ہیں' قومیتوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں' زبان کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ دین کا حوالہ اور اسلام کا حوالہ اب غیر موثر ہو گیا ہے۔

اہل کراچی پوچھتے ہیں کہ یہاں جتنے طبقات آباد ہیں ان میں سے صرف ایک طبقہ گولیوں کی زد میں کیوں ہے! مارنے والوں کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ دوسرے طبقے کے لوگ محض تماشائی کا رول ادا کر رہے ہیں۔ یہ عمل اس تقسیم کو مزید پختہ کر رہا ہے۔ لوگوں کو زیادہ دن تک بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں اور اپنی بے بسی پر دم سادھے بیٹھے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی طوفان آیا تو یہ ہراول دستہ کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ ظلم کی بھی ایک حد ہوتی

"لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے"

"یہاں ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں یہ جو فضل الرحمٰن ہے یہ بھی کہتا ہے کہ ہم پاکستان میں جمہوریت کے ذریعہ اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں' یہ قومی اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں آخر کیوں۔ انہیں خیال نہیں آتا کہ جو حکومت سود کا بیوپار کر رہی ہے' جس کے خزانے میں شراب پر ڈیوٹی کا پیسہ ہے' گھوڑوں کی ریس کا ٹیکس جو وصول کرتی ہے' سٹہ پر ایکسائز وصول کرتی ہے' اس خزانے سے یہ سارے دین نافذ کرنے کے دعویدار الاؤنس وصول کرتے ہیں اور اس حکومت کی حمایت میں مرے جا رہے ہیں؟۔ کیا یہ قابل مذمت نہیں ہیں؟ مگر میں بینظیر بھٹو کی طرح سب علماء کی مذمت نہیں کرتا۔ میں تو صرف ان مولانا صاحبان کو قابل مذمت سمجھتا ہوں جو اس عورت کے ساتھ مل کر دراصل اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ انہیں غالباً معلوم نہیں کہ اسلام یہ اسمبلی نافذ نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لئے تو اسمبلی کے باہر کام کرنا ہو گا اور اسلام انتخاب کے ذریعہ بھی نہیں آسکتا۔ کیا یہاں بھی امریکہ وہی کچھ ہمارے ساتھ نہیں کرے گا جو الجزائر میں اس نے کرایا ہے۔ امام خمینی کو شاہ ایران نے پیشکش کی تھی مگر ان کا جواب تھا کہ میرا ایمان اور عقیدہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں تمہارے ساتھ مل جاؤں کیونکہ تم جو نظام چلا رہے ہو۔ وہ کفر ہے" OO

(صدر مملکت کے ماموں اور ممتاز سیاستداں خانزادہ وحید خان کے "ہفت روزہ تکبیر" کو دیئے گئے انٹرویو سے اقتباس)

ہے۔ اس حد کے بعد قدرت اس ظلم کو کسی بڑے ظالم کے ہاتھ سے مٹا دیتی ہے۔ کفر کی حکومت تادیر چل سکتی ہے، ظلم کی حکومت کاغذ کی ناؤ ثابت ہوگی۔ ہمارا حکمران طبقہ نہ تاریخ سے سبق سیکھتا ہے نہ مشرقی پاکستان کے حادثے ہی نے اس کی آنکھیں کھولی ہیں۔ شاید اقتدار کی کرسی کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس پر بیٹھنے والا گردوپیش سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس نے جرائم میں اضافہ کردیا ہے۔ پہلے تو بڑے بڑے اسٹور لوٹے جاتے تھے اب تو محلہ کی چھوٹی دکانیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ راہ چلتے لوگ بھی لٹ جاتے ہیں۔ چھوٹے دکاندار بھی اپنے پیسے کیش بکس میں نہیں رکھتے نہ جیب میں رکھتے ہیں بلکہ ادھر ادھر چھپاتے ہیں مگر ریوالور کی زد میں آکر اپنی جان بچانے کے لئے جو کچھ ہوتا ہے آنے والے کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔

ملک میں مدرسے بھی چل رہے ہیں جن سے مولویوں کی کھیپ کی کھیپ نکل رہی ہے۔ محراب و منبر پر ان کا قبضہ ہے، مگر بدامنی اور برائی میں دن رات اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے مولوی حضرات کو ملک کے بناؤ بگاڑ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہیں تو محض اپنے مسلک سے دلچسپی ہے۔ عوام الناس کے ذہن کو خراب کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کے مسلکی جھگڑوں نے دین سے بیزاری پیدا کردی ہے، لوگوں کو مادہ پرست بنادیا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ خود بھی مادہ پرست ہیں۔ دنیا ہی ان کے پیش نظر ہے، عوام کو فروعی مسائل میں الجھا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں، یہی ان کا کھیل ہے۔

حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا کھیل زوروں پر ہے۔ فری اسٹائل کشتی جاری ہے۔ پہلے بھی ایک ریفری آیا تھا جس نے دونوں کو ہٹا کر خود کھیلنا شروع کردیا، مگر اس اکھاڑے میں وہ تنہا تھا، مقابلہ میں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راؤنڈ میں جیت جاتا تھا۔ اس نے گیارہ راؤنڈ کھیلے اور سب میں جیت گیا۔ یہ خود ساختہ کھیل بھی عجیب کھیل تھا۔ اس دوران دنیا نے ایک نئے قسم کا ریفرنڈم بھی دیکھا، مقابلہ میں کوئی نہیں تھا، یکطرفہ ووٹ ڈالے گئے اور ہر طرف سے شور اٹھا "ہمارا جیالہ جیت گیا ہو جمالو"۔ اب وقت بھی حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں "ہو جمالو" کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کھیل میں ریفری کون بنتا ہے، یہ تو وقت بتائے گا۔ اللہ کرے کہ اپنے ہی ملک کا ریفری آجائے ورنہ اگر کوئی دوسرا آگیا تو یہ کھیل ایسا بگڑے گا کہ "ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔ کیا اہل خرد پر بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ اہل سیاست تو اپنے کھیل میں لگے ہوئے ہیں۔ جو لوگ ان دونوں کے ساتھ ہیں انہیں کسی نہ کسی نوعیت کا مفاد حاصل ہے یا اس کے حصول کی توقع ہے۔ عوام الناس کی عظیم اکثریت کو مہنگائی نے بے دم کردیا ہے۔ صبح سے شام تک کا وقت پیٹ کے لئے ایندھن جمع کرنے میں صرف ہوجاتا ہے۔ اخبارات ہوا کے رخ پر چلتے ہیں۔ کبھی وہی پلڑا نیچے ہوجاتا ہے اور کبھی اوپر اٹھ جاتا ہے۔ ملک میں ایسی کوئی موثر قوت نہیں ہے جو انجام بد سے ڈرائے اور اس کھیل کو روک دے۔ ایک ایسے پریشر گروپ کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جو حالات کے رخ کو تبدیل کردے۔

اس ضرورت کا احساس امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو ہے۔ وہ ایک طویل عرصہ سے یہی صدا لگا رہے ہیں کہ مروجہ انتخابی سیاست سے ملک میں کبھی تبدیلی نہیں آسکے گی۔ وہی افراد حزب اقتدار میں ہوتے ہیں اور انہی سے حزب اختلاف بنتی ہے۔ یہ جاگیردار، سرمایہ دار خوانین اور وڈیرے ہیں یا ان کے چند گماشتے۔ اپنی صلاحیتیں انتخابی "دھکا پیل" میں صرف نہ کرو، منظم ہو کر ایک قوت بنو، ایک طاقت بنو، دنیا طاقت کی زبان کو سمجھتی ہے۔ انتخابی کھیل میں کچھ نہیں رکھا ہے اور تم دیکھ بھی چکے کہ آج تک اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آج اگر یہ پریشر گروپ منظم ہوتا تو وہ دونوں کا ہاتھ پکڑ کر روک دیتا۔ یہ ملک جو اپنے مقصد وجود سے انحراف کی طرف چل پڑا ہے اس کی باگیں کھینچ لیتا۔ لوگوں نے اس پکارنے والی کی پکار پر توجہ نہیں دی۔ بہت کم لوگ تھے جو اس کے دست و بازو بنے۔ وہ قرآن کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور آگاہ کر رہا تھا کہ جب تک قرآن کو اپنا رہبر اور امام نہیں بناؤ گے تمہیں فلاح کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اس ملک کا استحکام بھی اسی پر منحصر ہے۔ اصلاح احوال کے لئے نبی ﷺ کی تعلیمات کی طرف پلٹنا ہوگا، آپ کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ مروجہ طریقوں کو یکسر چھوڑنا ہوگا۔ اپنی زندگیوں میں وہ انقلاب لانا ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے۔ وہ راستہ اختیار کرنا ہوگا جس پر چل کر نبی ﷺ نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا تھا۔ آج بھی وہ راہ روشن ہے اور اس پر چلنے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

بقیہ: آخری وضاحت

میں نہیں سمجھتا کہ دین کا علمبردار کوئی آسمانی مخلوق ہوتی ہے جو طنز و مزاح کی حس سے بالکل مبرا ہو۔ مجھے حیرت اپنے بزرگ جنرل محمد حسین انصاری (ر) کی گرفت پر نہیں کہ وہ ایک سابق فوجی ہیں اور فوجی آدمی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بہت Tough اور Rough اور نظم (decipline) کا سخت پابند ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ جنرل صاحب ایک سابق سیاسی رہنما بھی ہیں اور اس حیثیت میں وہ پروفیسر غفور صاحب سے قریب بھی رہے ہوں گے لیکن بھائی اقتدار احمد صاحب کا ایک دم سے ہتھیار ڈال دینا جبکہ وہ خود بھی مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار اور ادب کے شہسوار ہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بے چارے فاروق عادل صاحب نے تو غالباً پروفیسر صاحب کی آڑ لے کر دل کی بھڑاس نکالی ہے کیونکہ انہیں اصلاً شکایت تو ہمارے اس شکوے پر ہوگی جو ان کے رسالے کی تنظیم اسلامی اور اس کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے بارے میں ان کے رویہ پر ہمیں ہے۔ سنا ہے کہ ہماری تنظیم کے کچھ اور رفقاء نے بھی احقر کی گرفت کی ہے۔ مجھے حیرت تو اس پر ہے کہ امیر تنظیم اسلامی پر پروفیسر غفور احمد صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ "مایوسی کا شکار" کی پھبتی کسی ہے اور اس پر ہمارے رفقاء خود تو کچھ نہیں کہتے اور احقر کے مزاح کے انداز میں کہے گئے الفاظ پر اسقدر ناراض ہیں۔ گویا کہ۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

والا معاملہ ہے۔ بھائیو! اپنی اس بوالعجبی پر خود ہی ذرا غور کرو کیونکہ "ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی"۔

بہرحال اگر داعی تحریک پر بے جا تنقید پر گرفت کوئی جرم ہے تو احقر یہ جرم کرتا رہے گا چاہے ندائے خلافت شائع کرے یا نہ کرے، چاہے ہمسفران راہ حق خوش ہوں یا ناراض، ہمیں تو خوشی اس کی مطلوب ہے جس کے دین کے لئے ہم نے یہ بھاری ذمہ داری قبول کرنے کی ہمت کی ہے۔ "ندائے خلافت" نہ سہی کوئی اور رسالہ، کوئی اور اخبار سہی۔ اگر کسی نے بھی تعاون نہ کیا تو بھی مضمون لکھ کر اس کو تلف کردینا اس سے بہتر سمجھوں گا کہ اپنے امیر پر بے جا تنقید سنوں اور خاموش رہوں۔ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تو میرا مضمون نوٹ ہوجائے گا۔ کیا پتہ وہی میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ وما علینا الا البلاغ۔ OO

• تین آسمانی مذاہب کی مقدس سرزمین، فلسطین تاریخ کے آئینے میں

• مسجدِ اقصیٰ کا انہدام اور ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر------یہود کا اگلا ہدف

فلسطین کے معنی ہیں مقدس سرزمین ---- مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں کے ماضی کی امین یہ سرزمین زبردست تاریخی اہمیت کی حامل ہے، جس کی اپنی جداگانہ عسکری، جغرافیائی اور سیاسی حیثیت ہے۔ براعظم ایشیاء کے مغرب میں، بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کے درمیان گھرا ہوا یہ خطہ شام، لبنان اور مصر کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ چار حصوں یعنی ساحلی، پہاڑی، درمیانی نشیب اور جنوب کے صحرائی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو یہاں کا محل وقوع ایسا ہے کہ براعظم یورپ، افریقہ اور ایشیا تین براعظموں میں آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں دوسرے یہ کہ دنیا کے تینوں بڑے مذاہب کا تعلق اس خطے سے جڑتا ہے جس نے اسے تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے مالا مال کر دیا ہے۔

یروشلم : فلسطین کا دارالحکومت، لگ بھگ ۳۰۰۰ ق م میں عربوں (کنانی) نے آباد کیا تھا۔ اس وقت یہ "گور سلم" کہلاتا تھا جس کے لفظی معنی تھے امن کا شہر۔ یہودی اس تاریخی شہر کو "شلم" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ شہر صرف یہودیوں کے لئے ہی نہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے بھی اتنا ہی مقدس ہے۔ ماضی میں یروشلم کئی مرتبہ حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا اور بڑی محنتوں سے دوبارہ تعمیر ہوا۔ نبوک نظر کے ہاتھوں ۵۸۶ ق م میں تباہ ہوا اور مروڈ (Merod) اعظم نے ۵۱۶ ق م میں ایک نئی شان سے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ سن ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے اسے تہس نہس کر دیا۔

عیسائی حکمرانوں نے مسیح علیہ السلام کے مقبرے کی ممکنہ جگہ پر مقدس مزار کا چرچ تعمیر کرایا۔ بعد ازاں مسلمانوں نے بہت سی یادگار عمارتیں تعمیر کرائیں جن سے اس شہر کی رنگارنگی میں اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک قبۃ الصخرہ ہے جو ۶۱۹ء میں تعمیر ہوا تھا اور مسلمانوں کے لئے مقدس ترین مقامات میں سے ہے، کیوں کہ اس کا تعلق حضرت محمد ﷺ کے معراج پر تشریف لے جانے کے واقع سے ہے لہٰذا ۶۹۱ء کو خلیفہ عبدالمالک بن مروان نے اس مقام پر مسجد تعمیر کرا دی تھی۔ انہی میں مسجد حضرت عمرؓ بھی ہے جو مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے کے بعد تعمیر کرائی گئی تھی۔ اسی طرح مشہور دیوار گریہ کہ جہاں ہر سال ہزاروں زائرین جمع ہوتے ہیں، یہودیوں کے لئے اہم ترین مذہبی مقام ہے۔

یروشلم دستی مصنوعات، خاص کر نسیجیں، لکڑی کے بنے صلیب اور موم بتیوں کے لئے بھی بڑی شہرت رکھتا ہے۔

غزہ : فلسطین کا پرانا دارالحکومت کنانیوں نے ۱۲ء ق م میں تعمیر کیا تھا۔ اسے حضرت محمد ﷺ کے دادا ہاشم بن ابو مناف کے نام پر غزہ ہاشم بھی کہتے ہیں۔ ان کی قبر اسی شہر میں ہے۔ عربی میں غزہ "مضبوط" کو کہتے ہیں۔ سطح سمندر سے ۴۵ میٹر بلندی پر واقع اس شہر کی اس وجہ سے عسکری اہمیت ہے کہ بحیرۂ روم کے ایشیائی اور افریقی ممالک کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے فوج اور تجارت کے میدان میں یہ شہر تاریخ میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ غزہ کو مصر کے گورنر عمرو بن العاص کی سرکردگی میں مسلم افواج نے ۶۳۶ء میں فتح کیا تھا۔ برطانوی راج کے دوران ۱۹۲۷ء میں اسے مصر اور لبنان سے ملانے والی ریلوے لائن تعمیر کی گئی۔ غزہ کی آبادکاری میں بہت ساری اہم تہذیبوں کا حصہ ہے جس کے باعث یہ عظیم شہر ثقافتی ورثے کے لحاظ سے بہت آگے ہے۔ مسلمانوں کی تعمیر کردہ یہاں کئی خوبصورت مسجدیں ہیں۔ رومی دور کے گرجا گھر بھی اب تک موجود ہیں جو عیسائی دور حکومت کی یادگاریں ہیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے اسرائیلی قبضے کے خلاف اسے فلسطینیوں کی مزاحمت کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں انتفادہ سب سے نمایاں ہے۔ زراعت کے علاوہ ماہی گیری اور کشتی سازی یہاں کی اہم صنعت ہے۔ آٹھ لاکھ کے قریب آبادی ہے۔

جافا یا یافو : یہ قصبہ بھی کنانیوں نے آباد کیا تھا۔ شروع میں یہ "یافے" کہلاتا تھا لیکن بعد میں "یوفا" کہلانے لگا۔ مشرق وسطیٰ کا یہ قدیم ترین شہر ہے جس کی تاریخ ساڑھے چار ہزار سال پرانی ہے۔ اس پر کئی حملے ہوئے اور طویل عرصے تک غلامی کی زندگی گزاری۔ پہلا حملہ ۱۷۷۵ء میں ہوا جس میں پانچ ہزار بے گناہ لوگ مارے گئے۔ دوسرا حملہ ۱۷۹۹ء میں نپولین نے کیا اور ساٹھ ہزار انسان قتل ہوئے۔ پہلی ریلوے لائن ۱۸۸۹ء میں تعمیر کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے جس کے ذریعے مشہور زمانہ ترشہ پھل دنیا کے مختلف ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے خوبصورت شہر کے باشندے زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ بعض ماہی گیری اور کشتی سازی کا کام کرتے ہیں۔ فلسطین کا سب سے پہلا انگریزی اخبار یہیں سے ۱۹۲۰ء میں جاری ہوا تھا۔

حیفہ : کنانیوں نے آباد کیا تھا۔ اس قصبے میں ایک جرمن آبادی ہے جو ۱۸۶۸ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس آبادی میں کئی دلکش گرجا گھر اور حضرت الیاسؑ اور ایشیؑ نے کچھ عرصہ یہاں دعوت دینے میں بسر کیا۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ محترمہ بھی مصر سے نصاریٰ جاتے ہوئے اس شہر سے گزرے۔ تاریخ کی پہلی لڑائی ۱۱۹۱ ق م میں اسی شہر میں لڑی گئی۔ ۶۲۰ء تک حیفہ پر یونانیوں کی حکمرانی رہی۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں انگریز کی آمد تک فلسطین میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ بحیرۂ روم پر اٹلی کی "مارسلیا" کی بندرگاہ کے بعد سب سے اہم بندرگاہ حیفہ کی ہے جو ۱۹۰۸ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ بندرگاہ متعدد بھاری صنعتوں کے لئے مشہور ہے۔

عکّو : سب سے پہلے اس شہر کو ۳۰۰۰ ق م میں کنانیوں نے آباد کیا۔ عکّو کے لفظی معنی ہیں "گرم ریت"۔ یہ شہر اپنی بندرگاہ کے لئے بہت مشہور ہے۔ یہاں بحری جنگی جہاز تیار ہوتے ہیں۔ پہلے یونانی اور بعد میں ۷۹۹ء تک ترک مسلمان حکمران رہے۔ نپولین نے اس شہر پر حملے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۵ / مئی ۱۹۴۸ء تک یہاں انگریز قابض رہے۔ اس شہر میں زیادہ تر بہائی آباد ہیں۔

سفد : مصر' لبنان اور شام کی سرحد پر واقع یہ شہر عسکری لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ یہاں ترک مسلمان حکمران تھے' جن کے بعد ۱۰ / مارچ ۱۹۴۸ء تک انگریز قابض رہے۔ انگریز اسے اسرائیل کے حوالے کر گئے۔ ۱۹۲۹ء میں یہ شہر شدید زلزلے کا شکار ہوا۔ برطانوی سامراج کے خلاف یہاں زبردست مزاحمت ہوئی۔ جس میں وہ تاریخی ہڑتال بھی شامل ہے جو ۱۹۳۶ء میں مسلسل چھ ماہ جاری رہی۔ اس شہر میں کئی خوبصورت مساجد اور عجائب گھر ہیں جنہیں دیکھنے ہر سال بہت سارے سیاح یہاں آتے ہیں۔

طبریاس : طبریاس ایک اجنبی نام ہے عربی میں اس کے معنی "چھلانگ" ہیں۔ اسے ۲۲ء میں آباد کیا گیا اور یہ سطح سمندر سے دو سو میٹر نشیب میں ہے۔ تجارتی لحاظ سے اسے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے اس جنگ کی وجہ سے بھی شہرت حاصل ہے جو ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں اور صلیبیوں کے درمیان ہٹن Hetten کے میدان میں ہوئی۔ حضرت شعیب' حضرت سلیمان' حضرت لقمان حکیم علیہم السلام اور ان کے بیٹے کی قبریں یہاں ہیں۔ ان کے علاوہ کئی صحابہؓ جن میں ابوعبیدہ بن جراحؓ ان کی اہلیہ اور ابوہریرہؓ کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ سیاحت یہاں کی اہم صنعت ہے۔

ناصرت : یہ قصبہ' جس کے ساتھ عیسائی دنیا کے بہت سے تصورات وابستہ ہیں' سطح سمندر سے چار سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اسرائیل نے ۱۶ جولائی ۱۹۴۸ء کو اس شہر پر قبضہ کیا تھا۔ یہاں کے باشندوں نے برطانیہ اور بعد ازاں اسرائیل کے خلاف شدید مزاحمت جاری رکھی۔ اس خوبصورت شہر میں چوبیس گرجے اور کئی مساجد ہیں۔

بسن : ۶۰۰۰ ق م میں کنانیوں نے آباد کیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ء سے اسرائیلی فوجوں کا قبضہ ہے۔ اکثر لوگ کاشتکاری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگ چھوٹا موٹا کاروبار کر لیتے ہیں۔ یہاں کی ریلوے لائن ۱۹۰۵ء میں تعمیر کی گئی تھی۔

نابلس : گرجوں کا یہ شہر انیس صدی ق م میں کنانیوں نے آباد کیا تھا۔ کئی پیغمبروں کی قبریں یہاں موجود ہیں' جن میں حضرت یوسفؑ کی قبر بھی شامل ہے۔ ۱۹۸۹ء میں یہاں ایک زلزلہ آیا جس سے کئی عمارتیں تباہ ہوئیں۔ یہاں کا زیتون سے بنا ہوا صابن دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں ۳۵ سے زائد مساجد ہیں جو اسلامی طرز تعمیر کا شاندار نمونہ ہیں۔

جریکو : دریائے اردون کے قریب یہ نخلستانی قصبہ تاریخی تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کے سبب بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا کا یہ قدیم ترین شہر ہے۔ یہاں کئی پرانے ٹیلے اور مٹی کی تہ کے نیچے دفن ایسے آثار موجود ہیں جو پچھلی تہذیبوں کا پتہ دیتے ہیں۔ جریکو کے لفظی معنی خوشبو یا عطر کے ہیں۔

بیت اللحم : (Bethleham) کہا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ یہ شہر ۲۰۰۰ ق م میں آباد ہوا تھا۔ اس شہر کو دو نبیوں یعنی حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہما السلام کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے شہرت اور تقدس حاصل ہے۔ لوگوں کا ذریعہ معاش مویشی پالنا اور کھیتی باڑی ہے۔

ہبرون : یہ تاریخی شہر سطح سمندر سے ۹۲۷ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ ۲۷۰۰ ق م میں تعمیر ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام یہاں کے اہم حکمران تھے۔ ۱۹۱۸ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۰۰ ق م میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی یہاں رہے۔ ان کی قبریں بھی یہیں ہیں۔

بیرشبہ (Beersheba:) سب سے پہلے کنانیوں نے اسے آباد کیا تھا اور انہوں نے ہی اسے یہ نام دیا تھا۔ چار ہزار سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز اسی شہر سے کیا تھا۔ شہر کے ارد گرد لاتعداد گھر پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگ زیادہ تر معدنیات کا کاروبار کرتے ہیں۔

نوٹ : کنانی اور عرب قبائل اصلاً جزیرہ نمائے عرب کے باسی تھے مگر اس علاقے کا بنجر ہونا ان کے فلسطین' لبنان' شام اور عراق کی جانب ہجرت کا باعث بنا' جہاں وہ چھ ہزار ق م سے پہلے ایک عظیم تہذیب قائم کر چکے تھے۔

ہیکل سلیمانی کی نئے سرے سے تعمیر کے بارے میں آج بھی یہودیوں کے مختلف طبقات میں اتفاق رائے موجود نہیں ہے۔ بابل کی "تالمود" کے مطابق ہیکل کا نزول مسیح کی آمد کے ساتھ براہ راست آسمان سے ہوگا۔ ایک دوسرا مکتبہ فکر اس بات کا قائل ہے کہ ہیکل کا تعمیر کیا جانا ایسا فرمان خداوندی ہے جو ناقابل تنسیخ ہے جبکہ یروشلم کی "تالمود" کی رو سے مسیح کے آنے تک کے درمیانی عرصے میں یہودی اپنی ایک عبادت گاہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ بہرحال مذہبی طبقے کا جہاں تک تعلق ہے' خاص کر کٹر یہودیوں کا ہی عقیدہ ہے کہ مسیحؑ ہی آکر ہیکل تعمیر کریں گے لیکن جدید سیکولر ذہن کا حامل صیہونی عنصر اس بات کا حامی ہے کہ اسرائیلی ریاست کے قیام سے سارا معاملہ طے ہو چکا ہے لہٰذا مسجد اقصیٰ کو گرا جلد از جلد یہاں ہیکل تعمیر ہو جانا چاہئے۔

ہیکل ثانی جسے ٹائٹس رومی نے ۷۰ء میں تہس نہس کر دیا تھا کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک ہی حصہ باقی رہ گیا تھا جو یروشلم میں "دیوار گریہ" کے نام سے یہودیوں کی آخری یادگار ہے۔ اگرچہ تاریخ میں اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا کہ حرم کی مغربی دیوار کو یہودیوں نے کب دیوار گریہ کا نام دے کر اس کے ساتھ ماتم شروع کیا' نہ ہی اس کا کہیں ثبوت ہے کہ یہ دیوار یہودیوں کے لئے عقیدت کا باعث ہے۔ تاریخ سے صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۴۶ء میں قاہرہ میں مقیم برطانوی سفیر نے برطانیہ کے بعض یہودیوں کی یہ درخواست مصر کی حکومت کو پیش کی کہ انہیں دیوار گریہ کو مرمت کرنے کی اجازت دی جائے مگر مصر کی حکومت نے یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ فلسطین اس وقت مصر کے زیر تسلط تھا۔ ۱۹۱۸ء میں فلسطین پر برطانیہ کے قبضہ کے بعد مختلف مواقع پر یہودیوں کی جانب سے اس دیوار کو خریدنے کی پیشکش کی گئی لیکن اس میں بھی انہیں مایوسی ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں انہوں نے طاقت کے ذریعے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جسے مسلمانوں نے ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد اگلے ہی سال انہوں نے پھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں کئی پر تشدد واقعات ہوئے۔ ان میں ۱۳۳ یہودی مارے گئے اور ۳۳۹ زخمی ہوئے۔ دوسری جانب ۱۱۶ مسلمان بھی

شہید اور ۲۳۲ زخمی ہوئے۔ اس پر برطانیہ کی حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا' جس نے یہ تصدیق کردی کہ مذکورہ دیوار مسلمانوں کی ملکیت ہے۔

مسلمان اس وقت تک اپنی جان پر کھیل کر مسجد کی حفاظت کا کام انجام دیتے رہے اور یہودیوں کو اس کے قریب بھی نہ آنے دیا جب تک ۲۷/ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے عربوں کو شکست دے کر یروشلم پر فوجی قبضہ نہیں کر لیا لیکن قبضہ ہوتے ہی اسرائیلی فوجوں نے بلڈوزروں کے ذریعے فوراً دیوار کے آس پاس کا علاقہ خالی کرالیا۔ اس روز دنیا کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ہیکل کو جلد تعمیر کیا جائے۔ لیکن اسرائیلی حکومت چونکہ جانتی ہے کہ اس کے قیام اور فلسطین پر قبضے کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز موجود نہیں اس لئے وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ درپردہ ایسی کارروائیوں میں مصروف ہے کہ جن سے مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل کی تعمیر ممکن ہو سکے۔ چنانچہ ایک طرف تو اسرائیلی فوج اور پولیس کی سرپرستی میں براہ راست حملوں کا سلسلہ جاری ہے جن کے ذریعے مسجد اور اس کے ملحقہ حصوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اور ایک ایک کر کے ان پر قبضہ کی کوشش کی جاتی ہے اور دوسری طرف اس پورے کمپلیکس کو نیچے سے مٹی نکال کر غیر مستحکم بنا دیا گیا ہے تاکہ کسی بھی وقت زلزلے یا مصنوعی دھماکے سے یہ عمارت دھڑام سے نیچے آگرے۔

جہاں تک اس منصوبے کے پہلے حصے کا تعلق ہے اس کی مختصر روداد کچھ یوں ہے۔

۱۹۶۷ء اگست کو اسرائیلی فوجی افسروں کی حفاظت میں فوج کے چیف ربی حرم میں داخل ہوئے اور "مراکوی" دروازے کی چابی زبردستی حاصل کر لی۔ ۱۹۶۹ء اگست میں یہودی ایجنٹوں نے تین اطراف سے مسجد کو آگ لگا دی۔ مسجد کی حفاظت پر مامور عملہ نے بڑی مشکل سے اس پر قابو پایا۔ لیکن اس دوران بہت سا قیمتی سامان اور مسجد کے جنوبی حصے کی چھت جل کر راکھ بن چکی تھی۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں ایک اسرائیلی عدالت کے ذریعے یہودیوں کو پیشگی اجازت لے کر حرم میں داخلے کا قانوناً حق حاصل ہو گیا۔ اگست ۱۹۸۱ء میں تین سو افراد کے ایک مجمع نے باب الحدید کا تالہ توڑ کر مسجد پر دھاوا بول دیا اور وہاں موجود مسلمانوں کو ڈرایا دھمکایا۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں ایک یہودی گروہ نے باب السلسلہ پر متعین گارڈ پر حملے کر کے اس کے ایک رکن کو زخمی کر دیا۔ دوسرے روز پھر ایسے ہی ایک حملے میں ایک گارڈ زخمی ہو گیا۔ اس سے اگلے ماہ ایک اسرائیلی فوجی نے مسجد میں داخل ہو کر تین مسلمانوں کو شہید اور سو کے قریب کو زخمی کر دیا۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو مسجد کے نواح میں ساڑھے تین ٹن وزنی ہیکل کا "سنگ بنیاد" لا کر رکھ دیا۔ ۲۹/ اگست ۱۹۹۰ء کو کمپلیکس پر امریکی ساخت کے دو اینٹی ٹینک راکٹ فائر کئے گئے۔ بعد ازاں ۸/ اکتوبر کو ہزاروں یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کی جانب مارچ کیا۔ اس پر مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہونا قدرتی امر تھا' جس کے نتیجے میں اسرائیلی فوج اور پولیس کی فائرنگ سے ایک فلسطینی شہید اور ایک سو چالیس زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ متعدد بار مسجد کے اندر اور گردونواح میں رکھے گئے بم اور دھماکہ خیز مادہ پکڑا گیا' جن سے مسجد کو مسمار کرنے کا کام لیا جانا تھا مگر اسرائیلی پولیس ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتی رہی۔ دوسری طرف بڑے منظم طریقے سے اندر ہی اندر سارا کام ہوتا رہا ہے' جس کے نتیجے میں کسی وقت بھی یہ پورا کمپلیکس زمین بوس ہو سکتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں یروشلم پر اسرائیلی قبضے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ پہلے سال مغربی جانب چودہ میٹر تک کھدائی کی گئی۔ اگلے دو سالوں میں مغربی دیوار (گریہ) کے ساتھ ساتھ اسے ۸۰ میٹر تک پہنچا دیا۔

۷۲-۱۹۷۰ء میں مسجد اقصیٰ کے جنوبی اور مغربی جانب کی دیواروں کی کھدائی شروع کی گئی اور نیچے سے مسجد کے صحن تک پہنچ گئے۔ اگلے چار سالوں میں مغربی دیوار کے نیچے تیرہ میٹر کی گہرائی تک پہنچ گئے اور ملحقہ مسلمانوں کے قبرستان کو جس میں دو صحابہ' عبادہ بن صامت اور شداد بن اوس رضی اللہ عنہما بھی دفن ہیں' ہتھیا لیا۔ حرم شریف کو چاروں طرف سے گھیرے میں لینے کے لئے ایک طویل سرنگ اس کے مشرق اور مغرب کی جانب سے نکالی گئی جسے مضبوط بنا کر وہاں ایک کمرے کا ایک سناگاگ تعمیر کر لیا جس کا درپردہ اسرائیلی صدر اور وزیراعظم نے افتتاح کیا۔

۲۵/ اگست ۱۹۸۱ء کو یہودی وزارت مذہبی امور کی جانب سے اعلان ہوا کہ مغربی دیوار سے مسجد کے صحن تک ایک سرنگ "دریافت" ہوئی ہے' جس کے بارے میں خیال ہے کہ قدیم ہیکل کا حصہ تھی۔ حالانکہ یہ سرنگ ایک برطانوی سیاح کرنل چارلس وارن نے ۱۸۸۰ء میں دریافت کی تھی۔ یہ سرنگ درحقیقت اس وقت مسلمانوں نے بنائی تھی جب ۶۹۱ء میں عبدالملک بن ہشام نے قبۃ صخرہ کی تعمیر کرائی اور ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ کی تعمیر کروائی ہوئی مسجد اقصیٰ کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کا کام کرایا۔ صلیبیوں نے اپنے مختصر قبضے کے دوران (۱۱۸۷-۱۰۹۹) اسے بند کرا دیا تھا' جس کے بعد یہودیوں نے نہایت رازداری سے اسے کھولا اور وہاں زبردست پہرہ بٹھا دیا تاکہ کوئی مسلمان اس جگہ کے قریب بھی نہ جا سکے۔

یکم ستمبر ۱۹۸۱ء کو یروشلم کے مسلمانوں نے اسے بند کرنے کی کوشش کی مگر اسرائیلی فوج نے انہیں پرے دھکیل دیا۔

۱۹۸۶ء کے بعد چاروں طرف سے مسجد کے صحن کے نیچے زیادہ زور شور سے کھدائی کا آغاز کیا گیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک کنوئیں کو جو "چٹان" کے قریب واقع ہے' نیچے سے بند کر رکھا ہے تاکہ جو مسجد کی دیکھ بھال کرنے والے مسلمان کھدائی کے دوران کوئی آواز نہ سن سکیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ صخرہ کے نیچے کا تمام حصہ مٹی سے خالی کر دیا گیا ہے اور ساری عمارت صرف پتھر کی بنیادوں پر کھڑی ہے جو کسی معمولی سے دھماکے سے نیچے آ سکتی ہے۔ دوسری جانب یہودی اس تمام عرصے میں کوئی ایک شے بھی سامنے نہیں لا سکے جس سے حرم کے حصے میں کسی ہیکل کا سراغ ملتا ہو ہاں اس کھدائی سے موشے دایاں اور یزل یادن جیسے لوگ کروڑ پتی ضرور بن گئے ہیں کہ جنہوں نے اوقاف کی زمین سے حاصل ہونے والے نوادرات کی غیر قانونی تجارت سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔○○

بقیہ : مکتوب کراچی

والوں کی رہنمائی کی منتظر ہے۔

اللہ کا وہ بندہ آج اس راستے کے ایک سرے پر کھڑا پکار رہا ہے کہ آؤ اس راستے پر جو صراط مستقیم ہے۔ آنکھیں کھولو دیکھو وہ تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔ اس ملک میں بگاڑ کی طاقتیں منظم ہو چکی ہیں۔ ان طاقتوں کی پشت پر عالمی استعمار ہے' وہ دن رات ریشہ دوانیوں میں لگا ہوا ہے۔ تم سے تمہاری شناخت چھیننا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بے لنگر کا جہاز کر دے گا' جو زمانے کی بے رحم موجوں میں اپنے وجود کو بچا بھی نہ سکے گا۔ اب بھی وقت باقی ہے۔ جو قومیں صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کرتیں انہیں دوبارہ موقع نہیں ملتا۔○○

اقتدار احمد

میناروں اور گنبدوں کا شہر' ——— استنبول

جہاں مغربیت نے مشرقیت کو پچھاڑ رکھا ہے' اس کے سینے پر سوار ہے

دو سال پہلے "ندائے خلافت" کے پانچ شماروں (۱۴/ستمبر تا ۲۶/اکتوبر ۱۹۹۲ء) میں میرے ایک سفرنامے "زبان یار من ترکی....." کی پانچ ہی اقساط شائع ہوئی تھیں کہ پھر وہ سلسلہ میری علالت کے باعث منقطع ہو گیا۔ اب اسے مکمل کرنے کا ارادہ ہوا تو میرے سامنے مسئلہ یہ درپیش تھا کہ دو برسوں کے فصل کے بعد میں بات آگے سے شروع کروں تو قارئین اس کا تعلق پچھلے مضمون سے کیسے جوڑیں گے۔ ایک حل تو یہ سمجھ میں آیا کہ جیسے بعض "مقبول عام" جرائد اپنی سلسلہ وار "دیومالائی" کہانیوں کا ہر بار باریک الفاظ میں خلاصہ دے کر واقعات کی سنسنی خیزی کو آگے بڑھاتے ہیں' ویسا ہی کچھ معاملہ کروں لیکن یہ تجویز دل کو لگی نہیں چنانچہ فیصلہ کیا ہے کہ سفرنامے کی صرف پہلی قسط نقل کروں تو نہ صرف واقعاتی ربط قارئین کے ذہن میں پھر سے قائم ہو جائے گا بلکہ اس تحریر کا وہ انداز بھی مانوس لگنے لگے گا جو باقی ماندہ (زیادہ سے زیادہ) چار قسطوں میں سامنے آنے والا ہے۔ وہ قسط دوبارہ اشاعت کے لئے پڑھی تو ظاہر ہے کہ کہیں کہیں الفاظ اور جملوں کی نوک پلک سنوارنے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ غالباً سبھی مبتدی اہل قلم اپنی پرانی تحریروں پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس مرحلے سے گزرتے ہوں گے اور اساتذۂ فن کی تو نقل کرنے کے لئے بھی جتنی عقل درکار ہے وہ مجھے میسر نہیں ——— مدیر

پچھلے سال انہی دنوں امریکہ میں تھا۔ شکاگو کے قیام کے دوران میرے میزبان ڈاکٹر خورشید ملک نے بتایا کہ آئی ایم اے کا دوسرا بین الاقوامی کنونشن آئندہ برس استنبول میں ہوگا جس میں حسب سابق برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد ہی کو مہمان مقرر کے طور پر بلانے کا پروگرام ہے۔ کنونشن کے چیئرمین ایک اور مہربان دوست ڈاکٹر طور تھے اور کنونشن سمیت آئی ایم اے کی سب سرگرمیوں کی روحِ رواں خود ڈاکٹر ملک گویا دونوں ہی میری دسترس میں تھے چنانچہ اپنی اس خواہش کو زبان دینے کی ہمت ہو گئی کہ۔

غالبؔ وہ اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ترکی دیکھنے کی حسرت تھی لیکن اب صحت اس بات کی متحمل نہیں رہی کہ اپنے طور پر تنِ تنہا شوقِ سیاحت کو پورا کرسکوں۔

چین و جاپان دیکھا' مشرق وسطی تقریباً پورا دیکھ لیا' مغربی یورپ کے بھی تین ممالک دیکھے ہیں اور امریکہ بھی اجنبی نہیں رہا۔ تب آتش جوان تھا یا کم از کم عہد رفتہ کے کچھ آثار باقی تھے' اب بڑھاپے کی آمد آمد ہے جس کے استقبال کے لئے مختلف النوع بیماریوں نے پہلے ہی صف بندی کرلی ہے چنانچہ سیر و سیاحت کی حسرت کو تھپک کر سلا دینے پر مجبور ہو گیا ہوں اِلّا یہ کہ کوئی ہمت والا ہی مجھ کو بھی ساتھ لے لے۔ ان دوستوں نے کمال مہربانی سے مجھے بھی دعوت دینے اور اپنے گروپ میں شامل کرنے کی ہامی بھرلی۔

ترکی سے مجھے بھی وہ جذباتی تعلق تو تھا ہی جو برعظیم پاک و ہند کے ہر مسلمان کو ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اولین حج کی سعادت نصیب ہوئی تو پہلی بار ترکوں کو دیکھنے کا موقع ملا جو اس سال چالیس ہزار کی تعداد میں آئے تھے۔ ترکوں کے لئے اپنی سیکولر حکومت کی طرف سے حج چند برس قبل ہی کھلا تھا' چنانچہ بوڑھے ترک مرد اور خواتین جوق در جوق آنے لگے جو نہ جانے کب سے اس آرزو کو دلوں میں چھپا چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ ان سے آمنا سامنا ہوتا اور اشاروں کی زبان میں ان کے سوال کا جواب مَیں "پاکستان" دیتا تو "پاچستان.... ایوب خان" کہتے ہوئے ان کی باچھیں کھل جاتیں اور پھر محبت کا زمزمہ بہنے لگتا۔ ان کی شفقت کے گہرے تاثر نے نہاں خانۂ دل میں گھر کر لیا۔

۱۹۷۵ء میں دمشق کے مرکزی اور وسیع چوک "میدانِ تحریر" میں واقع اپنے ہوٹل کے سامنے سڑک کی ریلنگ کے ساتھ کھڑا زندگی کی ہمہ ہمی کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک سامنے کے موڑ سے ترک حاجیوں کی بسوں کا قافلہ نمودار ہوا جن کی منزل مدینہ منورہ تھی۔ گھنٹے بھر تک اسے گزرتا دیکھنے میں محو رہتے مجھ پر بہزاد لکھنوی کا یہ شعر طاری ہو گیا کہ۔

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے' یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

بڑی دیر دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت رہی اور آخر مجھے اپنے کمرے میں واپس آکر پانی کے چھپکوں سے اس سوزش کو سرد کرنا پڑا جو روکنے کی کوشش کے باوجود امڈتے چلے آنے والے آنسوؤں نے آنکھوں میں پیدا کر دی تھی۔ انہی دنوں دمشق ایئرپورٹ پر شمالی افریقہ کے عرب اور بربر مسلمانوں کے ہجوم دیکھ کر اس تجربے سے کیوں نہ گزرنا پڑا تھا جو حج پروازوں کے انتظار میں ٹرانزٹ لاؤنج کے کونوں کھدروں تک میں ڈیرے ڈالے ہوا تھا' اس سوال کا جواب میرا دل ہی دے سکتا ہے۔ اس سے پوچھوں تو کیسے' دل کی بھی بھلا کوئی زبان ہوتی ہے؟۔

تین سال بعد سعودی عرب میں قدرے قیام کے دوران منیٰ میں شاہ اور ولی عہد کے زیر تعمیر محلات پر کچھ کام ایک ترک کمپنی کر رہی تھی اور کچھ میرے سعودی شریک کار کے پاس تھا جس کی ذمہ داری میرے پاکستانی کارکنوں پر تھی۔ انہیں ہدایات دینے جب بھی جدہ سے منیٰ جانا ہوتا اور واپسی شام تک مؤخر ہو جاتی تو اس کمپنی کے ترک کارکنوں سے "خاموش" ملاقات کا موقع مل جاتا۔ میرے کارکنوں اور ترکوں کے کچے پکے ڈیرے قریب قریب تھے جن کے درمیان ترکوں نے ایک عارضی مسجد بنا رکھی تھی۔ یہاں مغرب کی نماز میں ہی رونق ہوتی کہ ظہر اور عصر تو پڑھنے والے کام کے دوران ہی حسب موقع انفرادی طور پر ادا کر لیا کرتے ہوں گے۔ مغرب کی نماز کے لئے میں بھی وہاں چلا جاتا تو ترک بھائیوں میں خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی' وہ مجھے پاکستانی "مہندس" کے طور پر پہچانتے تھے۔ بڑے اصرار سے مجھے امامت پر آمادہ کرتے اور نماز کے بعد سب فرداً فرداً مصافحہ کرتے ہوئے مسکراہٹوں کی پھوار بکھیرا کرتے تھے۔ میری قراءت جیسی

کچھ بھی تھی' انہیں بڑی پسند آتی۔ نماز پڑھانے اور جماعت کے بعد اجتماعی دعا کا پاکستانی انداز بھی ان کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا۔

۱۹۸۳ء میں اپنے مرحوم لخت جگر' احمد کے ساتھ امریکہ جاتے ہوئے میں نے جرمنی میں تقریباً ایک ہفتہ گزارا۔ فرینکفرٹ سے گزر کر "بادن بادن" کے قصبے میں چند دن ٹھہرنے کے بعد جس کے دوران ہم نے پرانے مغربی جرمنی کو اندر سے بھی دیکھا بھالا' ہمارا آخری مستقر میونخ تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھائے پانچ چھ دن ہو گئے تھے کہ بازار سے گزرتے سیخ کباب کی خوشبو ہم فاقہ مستوں کے قدموں سے لپٹ کر رہ گئی۔ رک کر غور سے دیکھا تو یہ ترک بھائیوں کا ہوٹل تھا جہاں کباب سیخ پر چڑھے بھننے کے عمل سے گزر رہے تھے۔ اندر داخل ہوئے' بلند آواز سے السلام علیکم کہا اور جواب میں وعلیکم السلام سنائی دیا تو جان میں جان تو آئی لیکن ساتھ ہی پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے ایک تازہ اور زوردار زقند بھی بھری۔

"برادر! یہ حلال گوشت ہے نا؟۔" ہم نے کاؤنٹر پر کھڑے نوجوان سے پوچھا اور جس جواب کے لئے ہم اس وقت مرے جا رہے تھے' قسمت کی خوبی سے وہی ملا۔

"الحمدللہ' ہم مسلمان ہیں' آپ اطمینان سے کھائیے"۔

ہم نے کبابوں کا (اب پتہ چلا ہے کہ ترک انہیں کوفتہ کہتے ہیں) آرڈر دیا اور جا کر میز پر براجمان ہو گئے۔ نگاہوں نے ریستوران کا ایک چکر لگایا تو معلوم ہوا کہ درجنوں خواتین و حضرات حلال کھانے کو حلق سے اتارنے کے لئے سرخ یا سفید حرام مشروبات کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ ہم پانی مانگتے ذرا جھجکے تو سہی لیکن ہماری داڑھیوں نے ویٹر سے اس بے کیف مشروب کو طلب کرنا آسان کر دیا۔

اگلے روز جمعہ تھا اور ہم پہلے ہی ایک جمعہ کو مسافرت کی مجبوری کے تحت ظہر کی نماز میں تبدیل کر چکے تھے' سوچا کہ یہاں ترک تارکین وطن کی خاصی تعداد نظر آتی ہے تو کیا عجب کہ جمعہ کا اہتمام بھی ہو۔ اگلے روز اسی ریستوران میں پیٹ بھرنے کے بعد کاؤنٹر سے مسجد کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہیں قریب ایک گلی میں ہے۔ ہمارا ہوٹل بھی ساتھ ہی تھا' وہاں سے وضو کر کے مسجد کا رخ کیا جو ایک عام سی رہائشی عمارت کی دوسری منزل میں ایک درمیانے سائز کے اپارٹمنٹ میں واقع تھی۔ نمازی تین کمروں میں منقسم تھے' ان کے دروازے کھلے رکھ کر اس بڑے کمرے یعنی لاؤنج سے سمعی و بصری ربط قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس میں امام صاحب چھوٹے سے منبر پر بیٹھے بزبانِ ترکی خطبے سے پہلے کی تقریر کر رہے تھے۔ قبلے کا رخ آڑا تھا چنانچہ ترچھی صفوں نے خاصی جگہ ضائع بھی کر دی تھی لیکن جہاں کسی کے سینگ سمائے' بیٹھ گیا۔ خود ہمیں ایک بغلی کمرے میں بالکل پیچھے تنگ سی جگہ ملی جہاں سجدے میں پیش آنے والی دشواری پہلے سے ہی صاف نظر آ رہی تھی۔

امام صاحب ہمیں نظر تو نہ آئے لیکن ساؤنڈ سسٹم کی خوبی کے باعث ان کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔ چند الفاظ بھی مانوس سے لگے لیکن تقریر کے موضوع کا اندازہ مجھے قرآن مجید کی آیات اور احادیث شریفہ کے حوالوں سے ہوا جو سب کے سب شراب و خنزیر کی حرمت اور زنا کی مذمت اور نکیر میں تھے۔ ماحول کا عمومی نقشہ پاکستان کا سا تھا۔ فرضوں سے پہلے کی چار سنتیں پورے اہتمام سے پڑھی جا رہی تھیں' پھر فرضوں کی ادائیگی کے بعد ہم نے مسافرت کی سہولت کا فائدہ اٹھانے کے لئے کھسکنا چاہا تو سب راستے مسدود پائے۔ لوگ دھڑا دھڑ سنتیں اور نوافل ادا کر رہے تھے۔ سجدوں پہ سجدے' رکاتوں کے ڈھیر۔ سب لوگ فارغ ہو گئے تو ایک بار پھر امام صاحب نے طویل اجتماعی دعا کرائی۔ پاکستان سے باہر میرا واسطہ پکے "اہل سنت والجماعت" مسلمانوں سے پہلی بار پڑا تھا ورنہ عالم عرب میں تو لوگ جماعت کے ساتھ فرض پڑھنے کے فوراً بعد تتر بتر ہو جاتے ہیں۔

پھر اسی سفر میں امریکہ سے واپسی پر چندے لندن میں قیام کے بعد اسلام آباد کے لئے پی آئی اے کی پرواز لی تو راستے میں اس کا ایک سٹاپ استنبول تھا۔ نصف شب کے قریب جہاز وہاں رکا تو اعلان ہوا کہ مسافر چاہیں تو لاؤنج میں جا کر چہل قدمی کر سکتے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہاں "سوینئرز" کے سٹال پر قرآنی طغرے اور مخطوطات ضرور دستیاب ہوں گے جنہیں لکھنے میں ترکوں نے کسبِ کمال کیا چنانچہ ہم دونوں باپ بیٹے اپنے پرس جیبوں میں ٹھونس کے دوڑے اور توقع کے مطابق وہاں موجود سٹال پر پہنچ کر دم لیا لیکن اس کا دروازہ مقفل تھا۔ شوکیس میں سجے ہوئے قرآنی آرٹ کے نادر نمونے ہماری آتشِ شوق کو بھڑکاتے رہے لیکن وہاں آس پاس بھی کوئی موجود نہ تھا جو یہ پوچھ ہی سکتے کہ بھلے آدمیو سامنے سے خانہ تو بڑا آباد ہے' ہمارے مرکزِ شوق پر تم نے تالا کیوں ڈال دیا؟----- مایوسی کے داغ کے سوا وہاں سے کچھ نہ ملا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں ترکی کی جو جھلک نظر آئی اور نئی نسل سے تعلق رکھنے والے مقامی عملے کے چہرے بشرے میں پاکستانیوں کے لئے جیسی بیزاری و سرد مہری محسوس کی' اس نے ذہن میں یہ کرید البتہ لگا دی کہ یہ تاثر پچھلے تجربات سے اتنا مختلف ہے تو دیکھا چاہئے کہیں ایک ہی ملک میں دو قومیں تو آباد نہیں!۔

اب ۲۹/ جولائی کی سہ پہر برادرم ڈاکٹر اسرار احمد کی معیت میں استنبول پہنچا تو گویا ایک پرانی خواہش پوری ہوئی۔ امیگریشن کے متعدد کاؤنٹروں میں سے نصف پر خواتین اور باقی پر مرد افسر آنے والے مسافروں سے نمٹ رہے تھے۔ ہم ایک "مردانہ لائن" میں لگ گئے۔ میزبان تنظیم آئی ایم اے کے مقامی کارکن جن کا تعلق استنبول کی ایک بڑی سیاحتی کمپنی "وی آئی پی" سے تھا' کاؤنٹروں کے پیچھے سے ہمیں ہاتھوں میں پکڑے ٹی بورڈ دکھا کر اطمینان دلا رہے تھے کہ آپ کو پہچان لیا گیا ہے۔ محسوس ہوا کہ ہماری لائن ذرا آہستہ کھسک رہی ہے جبکہ ساتھ والی خاتون بڑی چابک دستی سے پاسپورٹوں پر ٹھپے لگا کر نو واردوں کو فارغ کر رہی تھیں۔ اپنا نمبر آنے پر میں نے دونوں پاسپورٹ ان کارڈوں سمیت پیش کر دئے جو ہوائی جہاز میں دئے گئے اور میں نے بڑے اہتمام سے جن کی خانہ پری کی تھی۔ وہ کارڈ بڑی بے نیازی سے واپس دھکیل دئے گئے۔ صاحب بہادر کی توجہ کام کی طرف نہیں تھی چنانچہ ہمارے پاسپورٹوں میں ویزے تلاش کرنے میں بھی انہیں خاصا ہی وقت لگا۔

کسٹم والوں سے ہماری جان وی آئی پی والوں نے چھڑا دی جو ہماری منفرد وضع قطع اور سامان میں کتابوں کے تین بھاری بنڈل دیکھ کر ذرا چوکس ہو گئے تھے۔ ہم کسٹم افسر کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ وی آئی پی کا ایک تیز طرار کارکن لپک کر آیا اور دو ایک چلتے ہوئے سے جملے کسٹم افسر کی طرف اچھالتا ہوا ہماری لدی پھندی ریڑھی کو کھینچ کر باہر نکال لایا۔ اس کی بات ہماری سمجھ میں ظاہر ہے کہ نہیں آئی اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی!۔ یہ ضرور ہے کہ کتابوں کے بنڈل اگر کھلوا لئے جاتے تو انہیں سینٹنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ آئی ایم اے کے کنونشن کے مندوبین اطراف و جوانب سے مختلف پروازوں کے ذریعے پہنچ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وی آئی پی کے کارندوں نے بھاگ دوڑ کر کے پچیس تیس خواتین و حضرات کو جمع کر لیا جن میں سے کئی ڈاکٹر صاحب سے بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے کہ کہیں اور نہیں تو دو برس قبل پیکن میں ہونے والے آئی ایم اے کے پہلے بین الاقوامی کنونشن میں تو وہ ان سے ملاقات کر ہی چکے تھے۔

اب ایک آرام دہ ائر کنڈیشنڈ ٹورسٹ بس میں ہمارا رخ قیام گاہ کی طرف تھا۔ موسم خوشگوار تھا جیسا بحیرۂ روم کے خطے میں ہونا چاہئے لیکن ہلکی بوندا باندی نے فضا کو ذرا بوجھل کر دیا تھا لہٰذا ائر کنڈیشننگ غنیمت محسوس ہوئی اور وہ پسینہ خشک ہونے پر آ گیا جو سامان کو وصول کرنے اور پھر اسے ریڑھی میں دھکیلنے کے مراحل میں جسم کو نہلا گیا تھا۔ سفر بہرحال سفر ہے' چاہے آواز سے تیز رفتار طیاروں کے ذریعے طے کیا جائے ---- "السفر قطعة من العذاب" ---- ائرپورٹ کے علاقے سے نکلتے ہی

اندازہ ہو گیا کہ ہم مشرق کو پیچھے چھوڑ کر مغرب میں نکل آئے ہیں۔ استنبول شہر کا یہ حصہ یورپ میں ہے اور یورپ ہی لگتا بھی تھا سوائے اس کے کہ صفائی کا وہ اہتمام نہیں اور خوشحالی ویسے اُمڈی نہیں پڑتی۔ گائیڈ نے مائیک سنبھال کر ہمیں مخاطب کیا۔ "خواتین و حضرات! میں آپ کو جمہوریہ ترکی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ ایک خوبصورت "موزلم" لیکن سیکولر ملک ہے' مصطفیٰ کمال نے جس کی تعمیر کی۔ وہ اتاترک (باباے قوم) تھا اور میں بھی اس کا ایک بیٹا ہوں' یا پوتا کہہ لیجئے"۔ وہ اپنی گفتگو میں مزاح کا رنگ پیدا کرتے ہوئے خاصی رواں انگریزی بول رہا تھا اور راستے میں آنے والے مقامات کی طرف اشارہ کر کے ان کا تعارف کراتا رہا۔ میں نے اچٹتی نگاہوں سے دائیں بائیں کے مناظر دیکھے کہ اب تکان کا غلبہ تھا اور جی چاہتا تھا کہ جلد از جلد قیام گاہ پہنچ کر آرام کا موقع ملے۔ گزشتہ شب کراچی کے مڈوے ہوٹل میں ڈیڑھ دو گھنٹے کی استراحت کے بعد اس فضائی سفر نے تھکا مارا تھا جو عمان اور دمشق کے سٹاپ کے باعث خاصا ہی طویل ہو گیا۔

ہمارا قیام استنبول کے ایک "پوش" علاقے "تقسیم" کے مرکزی چوک میں واقع مرمرہ ہوٹل میں تھا۔ بائیس منزلہ مرمرہ کا شمار وہاں کے بڑے فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہوتا ہے جن کی یہاں سیاحت کی "انڈسٹری" کے فروغ کے باعث کمی نہیں البتہ سب سے مہنگا ہوٹل چراغاں پیلس ہے جو کبھی شاہی محلات کا ایک حصہ تھا' آبنائے باسفورس کی ہلکی ہلکی لہروں کے ہلکورے جس کے شاہی بائیں باغ کی روشوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں اور جہاں آپریشن ڈیزرٹ سٹارم کی تیاری کے مرحلے میں امریکی صدر جارج بش اپنے دورۂ ترکی کے دوران قیام پذیر ہوئے تھے۔ مرمرہ کے نصف سے زیادہ کمرے کنونشن کے مندوبین کے لئے محفوظ تھے جن میں سے بعض سیر و تفریح کے لئے اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے آئے تھے چنانچہ استقبالیہ سے ملحقہ راہداری پر آئی ایم اے کا قبضہ تھا جہاں ان کے دفتر معلومات کے کاؤنٹر کے علاوہ دی آئی پی کی کارکن لڑکیوں کی میزیں بھی لگی ہوئی تھیں جو مہمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے اجتماعی یا انفرادی سیر و سیاحت کا اہتمام بھی کرتی تھیں۔

عقبی زیریں حصہ (Basement) بھی کنونشن کے استعمال میں تھا جس کے بڑے بڑے "ہال روموں" میں سے ایک بڑے ہال میں کنونشن کے لئے نشستیں لگا دی گئی تھیں اور ایک نسبتاً چھوٹے ہال میں آئی ایم اے نے صاف ستھری چادریں بچھا کر عارضی مسجد بنا لی تھی۔ اس "مسجد" میں جس کے سر پر میخانہ آباد تھا' مندوبین حسب موقع باجماعت اور انفرادی طور پر نمازیں ادا کرتے رہے البتہ فجر کی نماز کے بارے میں طے تھا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب پڑھائیں گے جس کے بعد انہوں نے روزانہ اوسطاً نصف گھنٹے کی ہر تقریر میں ان مسلمان مرد اور خواتین ڈاکٹروں کو دین کا کوئی ایک بنیادی سبق یاد کرانے کی کوشش کی جن کی اکثریت شمالی امریکہ سے آئی لیکن اصلاً پاکستان' بھارت' دیارِ عرب اور ایران سے تعلق رکھتی تھی۔

صبح کی ان پانچ مختصر گفتگوؤں میں ڈاکٹر صاحب نے بزبانِ انگریزی سورۂ حجرات سے ماخوذ اس مضمون کو تذکیر کا موضوع بنایا جس میں نو مسلم بدوؤں سے فرمایا گیا کہ تم ایمان کا دعویٰ نہ کرو' یہ کہو کہ اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو گویا ایمان اور اسلام دو مختلف کیفیات کے نام ہیں یا یوں کہئے کہ مسلم اور مومن میں کوئی اتنا نمایاں فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی ٹوکنے کی ضرورت محسوس کی جو فتح مکہ کے بعد خود حضور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہی فوج در فوج اسلام کی فصیل میں داخل ہوئے تھے ..... یدخلون فی دین اللہ افواجا ..... اسلام اور ایمان کے فرق کو واضح کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے دونوں کی ماہیت اور خصائص پر روشنی ڈالی۔ ارکان اسلام تو ہم انگلیوں پر گن لیتے ہیں' بتایا کہ ایمان کے اضافی رکن کون سے ہیں پھر یہ کہ اسلام کا تعلق دنیا میں مسلمانوں کے باہمی معاملات اور اسلامی ریاست میں مسلمان کے حقوق و فرائض سے ہے جبکہ آخرت میں فلاح و نجات کا دارومدار ایمان پر ہے اور آخر میں ان سیدھے اور صاف سمجھ میں آنے والے منصوص و مسنون خزانوں کی نشان دہی بھی کی جن سے ایمان کی دولت سمیٹی بلکہ لوٹی جا سکتی ہے۔

فجر کی نماز اور بعد کی ان نشستوں میں پندرہ بیس فی صد مہمان خواتین و حضرات باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے رات کو سونے میں بہت تاخیر ہو جاتی تھی اور صبح کو تیار ہو کر بروقت نماز کے لئے پہنچنا ہرگز کوئی آسان کام نہ تھا۔ سامعین میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے سابق نائب وزیراعظم و وزیر خارجہ اور معروف دانشور جناب ڈاکٹر ابراہیم یزدی نمایاں تھے جنہوں نے ایک دن بھی ناغہ نہ کیا۔ وہ نماز اپنے مخصوص طریقے سے لیکن جماعت میں شامل ہو کر ادا کرتے اور ڈاکٹر صاحب کی گفتگو پوری توجہ سے سنتے تھے۔ آخری دو نشستوں میں زغرب کے ڈاکٹر عزت اگانووچ بھی شریک ہوئے جن کے لئے یہ باتیں بالکل نئی اور بہت حیرت انگیز تھیں۔ وہ بوسنیا کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی فریاد مسلمان ڈاکٹروں تک پہنچانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

مرمرہ کی چودھویں منزل کے کمرہ نمبر ۱۴۱۸ میں فروکش ہو کر غسل کے بعد برادر محترم نے تو آرام کو ترجیح دی لیکن میں اس کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود زیادہ دیر بستر میں دراز نہ رہ سکا اور نیچے ہوٹل کے لاؤنج میں اُتر آیا جہاں اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ (آئی ایم اے) کے کنونشن کے باعث رونق خلافِ معمول بہت زیادہ تھی۔ یہاں کے ماحول میں غیر ملکی مسلمان ڈاکٹروں کی چہل پہل سے کچھ تھوڑا سا فرق واقع ہو گیا تھا وگرنہ ہر چہار طرف خالص مغربیت کا راج تھا۔ شاید عام دنوں میں احساس تک نہ ہوتا ہو گا کہ یہ کسی مسلمان ملک کا ہوٹل ہے جس کی اپنی بھی کوئی تہذیب و ثقافت اور ایک درجے میں ہی سہی' کوئی شناخت بھی ہے۔ میں متحرک زینے سے اتر کر لابی میں اور پھر گھومتے ہوئے دروازے سے گزرتا ہوا باہر نکل آیا۔ اندر سنٹرل ائرکنڈیشننگ کے باعث فضا میں گھٹن سی تھی' باہر تازہ ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا تو بڑی ہی فرحت ہوئی۔ گاڑیوں کی ریل پیل اور نظر نہ آنے والے دھوئیں کی آلودگی کو وسیع و عریض کھلے چوک میں بے روک ٹوک چوکڑیاں بھرتی' اٹھلاتی ہوا نے چٹکیوں میں اُڑا دیا تھا جو ترکی کے اپنے سمندر' بحرِ مرمرہ سے نہا دھو کر آتی تھی۔ یہ چوک "تقسیم سکوئر" جدید جمہوریۂ ترکی کی نمائندگی کا حق ادا کرتا ہے۔ سامنے سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے جس کے بعد زمین سے ذرا بلند ایک سرسبز و شاداب پارک ہے اور اس کے عقب میں ہلٹن ہوٹل۔ دائیں جانب ایک شاندار کنونشن سنٹر ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر بڑی بڑی مصروف سڑکیں ڈھلوان کی طرف اُتر رہی ہیں جن پر تین چار منزلہ کمرشل عمارتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ سامنے پارک کی بائیں جانب سے ایک جدید بازار ابھرتا آتا ہے جو چوک کو عبور کر کے مرمرہ ہوٹل کے ساتھ واقع بنک کی عمارت سے لگی ہوئی ایک دم نیچے کو اترتی سڑک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس پر دو رویہ قدیم رہائشی عمارتیں ہیں' کوئی بھی تین منزل سے کم نہیں۔ بائیں طرف ذرا فاصلے پر برقی ٹرام کا پُرہجوم سٹاپ ہے جس سے دو عام قسم کے بازار شروع ہو رہے ہیں لیکن تیوران کے بھی مغرب سے مستعار ہیں۔ استنبول کا شہر اور یہ شہر ہی کیا' پورا ترکی بلندیوں اور پستیوں کا حسین امتزاج ہے۔ ہموار راستوں اور سڑکوں کا یہاں کیا کام!

تقسیم سکوئر کے ایک کونے میں آثارِ قدیمہ میں شمار ہونے والی چھوٹی سی مسجد ہے۔ بظاہر اس کی سنگین دیواروں اور خوبصورت اکیلے گنبد کا کچھ نہیں بگڑا لیکن دروازوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں' غالباً اندر سے خستہ حال ہو گی۔ اس کے مینار پر نصب لاؤڈ سپیکر سے بلند ہونے والی "حی علی الفلاح" کی آواز کے جواب میں کوئی نماز پڑھنا چاہے تو اسے متقفل مسجد کے پہلو میں نصب اشارے کی تقلید میں دو چھوٹی عمارتیں چھوڑ کر ایک زینہ چڑھنا پڑتا

ہے جو ایک چھوٹے سے کمرے میں کھلتا ہے۔ میری نگاہیں چوک میں جھاڑو پھیرتی رہیں۔ کہنے کو تو استنبول میں مشرق و مغرب گلے ملتے ہیں لیکن یہاں مشرق مارے انکسار کے بچھ گیا اور مغرب اس کی چھاتی پر سوار ہے۔ مغربیت مشرقیت کے سینے پر گویا مونگ دل رہی ہے۔ خانہ جنگی سے پہلے کے بیروت کی تو بات ہی اور تھی' دمشق میں تقریباً یہی حال دیکھا اور قاہرہ کی پوش آبادیوں میں بھی صورتِ حال زیادہ مختلف نہ تھی لیکن یہاں دنیا کے اس واحد شہر پر جو دو براعظموں میں واقع ہے' یورپی تہذیب کے اس اضافی رنگ کی چھاپ بھی ہے جو بے حیائی کی آخری حدوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے سڑکوں فٹ پاتھوں پر اور پارکوں میں مٹرگشت اور خوش فعلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ عریانی خطرے کے نشان سے بس ذرا نیچے ہے یعنی سینۂ شمشیر سے شمشیر کا دم ابھی پوری طرح باہر نہیں آیا لیکن آثار یہ نظر آتے ہیں کہ ۔

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوش مند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی' نہ زن اوٹ چاہے گی

بے چاری مشرقیت تو تقسیم چوک میں بھیک مانگتی نظر آئی۔ مشرقی ساتر لباس میں ملبوس لیکن کھلے چہروں کے ساتھ ادھیڑ عمر کی دختران مشرق ایک ایک دو دو بچوں کو ساتھ گھسیٹتی راہ گیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کئی کئی گز منت و زاری کرتی ایک ایک کے پیچھے دوڑتی ہیں لیکن دیکھا کہ ان کی مراد کم کم بر آتی ہے۔ چوک میں جابجا چھوٹے چھوٹے خوانچے سامنے رکھے لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے بھی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بیروت میں آپ کہیں جا کھڑے ہوں' لڑکے بالے اور از کار رفتہ بوڑھے "یا نصیب' یا نصیب" کہتے اور ہاتھ میں پکڑی لاٹری کے ٹکٹوں کی کاپیاں آپ کی طرف بڑھاتے منڈلانے لگتے۔ "یا نصیب" کی آواز آخر تک پہنچتے ایک سیٹی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہاں کوئی آوازیں تو نہیں لگاتا لیکن بہت لوگوں کی انگلیوں' آرزوؤں کو یہاں بھی لاٹری کی ڈوری نے زندگی کی محرومیوں کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

استنبول میناروں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ جدھر دیکھئے خوبصورت' سڈول' بلند و بالا مینار ہی نظر آتے ہیں۔ اکثر مساجد کی چوکسی کرتے ہیں اور یہی حال گنبدوں کا ہے' ایک جیسے شاندار' یکسانیت اور بوقلمونی کا حسین امتزاج لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس پرانے قسطنطنیہ میں بعض گرجاؤں پر بھی ویسے ہی دراز قد میناروں کا پہرہ ہے اور ان کے سروں پر بھی گنبدوں کے تاج ہیں۔ کسی نووارد کو یہ پہچان پیدا کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے کہ اس کی نظریں مسجد کے گنبد و مینار کا طواف کر رہی ہیں یا کلیسا کے کسی کلس سے الجھ کر رہ گئیں۔ ویسے مساجد کا یہاں کیا شمار! مسلم دنیا کا کون بڑے سے بڑا شہر ہے جو مسجدوں کی تعداد' ان کی وسعت اور سربلندی میں استنبول کے مقابلے کی سوچ بھی سکے۔ ہم لاہور کی بادشاہی مسجد لئے پھرتے ہیں اور غالباً اسے دنیا کی سب سے بڑی مسجد بھی کہتے ہیں' کیا صرف کھلے صحن کے رقبے کے بل پر؟۔ بادشاہی مسجد کے مشرقی حصہ سے بڑے اللہ کے کئی گھر تو خود لاہور میں موجود ہوں گے۔ اللہ مسجدیں دیکھنے کا شوق دے اور فنِ تعمیر سے بھی دلچسپی ہو تو کم از کم ایک مہینہ استنبول کی صرف مساجد دیکھنے کے لئے درکار ہے' ایک ہفتے میں تو آدمی ورطۂ حیرت سے ہی باہر نہیں نکل پاتا۔○○

بقیہ : اداریہ و شذرہ

شاخسانہ ہے اور ابھی کیا' یہ بھی عربوں کے اس کامل اقتصادی استحصال کی ایک تمہید ہی تو ہے جس کا انتظام نیو ورلڈ آرڈر نے صیہونیت کو فراہم کر کے دیا ہے اور یہ ابتدائے عشق ہے' آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ پورا عالم عرب اسرائیل کی چراگاہ بننے والا ہے۔ ہم تو مسجد اقصیٰ اور یروشلم کو ہی روتے ہیں' عربوں کے انجام پر آسمان بھی روئے گا اور ان کے ہوش ٹھکانے نہ آئے تو وہ وقت کچھ زیادہ دور بھی نہیں۔ پھر آخری معرکہ ہلال و صلیب انہی کے علاقے میں ہوگا' غلبۂ دین کے اس حتمی مرحلے میں خراسان کے عجمی مسلمان اپنے پھریرے لہراتے اسلام کی نصرت کو وہاں پہنچیں گے اور یہ خبر الصادق المصدوق ﷺ نے ہمیں دی ہے۔ اے اللہ ہمیں بھی مسلمانوں کے انہیں لشکروں کا حصہ بننا نصیب فرما۔ آمین۔

بقیہ : خطبۂ خلافت

کا کام ہے۔ اس کام کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک عوامی سطح پر نظام خلافت کی برکات کو عام کرنا ہے۔ دوسری سطح نظام خلافت کے اجتماعی نظام اور درپیش جدید مسائل کو علمی سطح پر تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچانا۔ یہ دوسرا کام ہے کہ جس کے لئے یہ خطبات خلافت کا انعقاد ملک کے تمام بڑے شہروں میں کیا گیا ہے۔ یہ کام بہت ہی اہم ہے۔ اس لئے کہ اسلام کا نعرہ لگانا آسان ہے لیکن جدید دستوری و معاشی مسائل سے پنجہ آزمائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ عوام کو نظام خلافت کی برکات سے آگاہ کرنے کے لئے تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے جلسہ ہائے عام اور کارنر میٹنگ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تحریک خلافت کے پیش نظر کوئی فوری ہنگامہ ہرگز نہیں ہے۔

تحریک خلافت کے نظم کے لئے ہم نے بیعت کی شرط نہیں رکھی۔ اس میں شمولیت گویا کہ ایک طرح کی معاونت ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" اگر آپ کو اس کام سے اتفاق ہے تو ایک معاون فارم کے ذریعے آپ تحریکِ خلافت کے معاون بن جائیں گے۔ گویا یہ آپ کی طرف سے معاونت کا ایک وعدہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اب آپ اس کام کے لئے اپنا کچھ وقت' پیسہ اور صلاحیت بھی خرچ کریں گے۔ تحریک خلافت کے معاون بننے کے بعد آپ ہمیں اور ہمارے کام کو زیادہ قریب سے دیکھ سکیں گے۔ لہٰذا اس سے اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ یہی اعتماد اور جذبہ آپ کو تنظیم اسلامی میں لے آئے گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اصل شے کہ جسے مضبوط کرنا ہے' تنظیم اسلامی ہی ہے۔

خطبات خلافت کا اختتام میں اس پکار پر کرنا چاہتا ہوں کہ "من انصاری الی اللہ" یعنی کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں۔ میری مدد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ تنہائی میں میرے لئے دعا خیر کریں۔ میرے ساتھ تعاون کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ آپ انجمن خدام القرآن سے وابستہ ہو جائیں۔ میرے ساتھ تعاون کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نوجوان اپنی زندگی کا ایک سال فارغ کر کے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں شامل ہو کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرے ساتھ تعاون کی بلند ترین سطح یہ ہے کہ آپ لوگ تنظیم اسلامی میں شامل ہو کر میرے اعوان و انصار اور دست و بازو بنیں۔ یہ بات میں ضرور کہوں گا کہ تنظیم اسلامی میں شمولیت سے پہلے میرے حوالے سے پورا اعتماد حاصل کر لیجئے۔ تنظیم میں شمولیت علی وجہ البصیرۃ ہونی چاہیے۔ میرے ساتھ تعاون کا تیسرا اور کم از کم درجہ یہ ہے کہ آپ تحریک خلافت کے معاون بنیں۔ جن لوگوں نے چار دن مسلسل خطبات خلافت کے لئے چار گھنٹے روزانہ نکالے ہیں' اس کا کچھ نہ کچھ عملی نتیجہ بھی ضرور نکلنا چاہئے۔○○

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی!
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی!

اقبال

اسلام اور مغرب

مغربی مفکرین کا نقطۂ نظر

ان دنوں مغربی مفکرین کے حلقے میں ایک انتہائی تشویشناک قسم کی بے چینی پائی جاتی ہے۔ مغرب کے اہل فکر' یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ اداروں سے وابستہ پالیسی ساز اور چوٹی کے عالمی رہنما اس صورتحال سے انتہائی پریشان ہیں کہ آج پوری دنیا میں ایک بار پھر سے اسلام کی دوبارہ واپسی کا واضح خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ اسلام جو اپنے آنے کے بعد سے مسلسل بارہ صدیوں تک دنیا کی واحد سپرپاور کی حیثیت سے عالمی منظرنامے پر چھایا رہا تھا' وہ ایک بار پھر سے دنیا کی سیاسی قیادت کے لئے بے چین ہے۔ گویا کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کے سقوط کے بعد اور مسلم ممالک کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے کے بعد مغرب نے اطمینان کرلیا تھا کہ اب اسلام کے دوبارہ غلبے کا دور دور تک کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن ابھی خلافت کے سقوط کو صرف ستر سال گزرے ہیں اور اس مختصر سے عرصے میں پوری دنیا میں اسلام کے غلبے کے لئے ہر طرف چیخ و پکار کا بازار گرم ہے۔ گویا کہ مغرب کا خوف کہ اسلام دوبارہ آرہا ہے اپنے پیچھے کچھ حقیقی بنیاد بھی رکھتا ہے۔ امریکہ جو اس وقت خود کو دنیا کی واحد سپرپاور کہتا ہے اور جسے بظاہر دنیا کی سب سے بڑی قوت کی حیثیت سے تسلیم بھی کرلیا گیا ہے' سخت خائف ہے کہ اس کی یہ چودراہٹ شاید زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکے گی۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد امریکی مفکرین کا خیال تھا کہ اب حتمی فتح امریکہ کے حق میں ہوچکی ہے' لیکن اب یہ احساس عام ہوتا جارہا ہے کہ ابھی اصل مقابلہ باقی ہے جو دراصل اسلام اور مسلم دنیا سے ہونا ہے۔

ابھی گزشتہ دنوں لندن سے شائع ہونے والے معروف عالمی جریدے "اکانومسٹ" نے اسلام اور مغرب کی چپقلش پر ایک دلچسپ سروے شائع کیا ہے' جس میں اس امکان کا جائزہ لیا گیا ہے کہ آنے والے دنوں میں دنیا کی قیادت کس کے ہاتھ میں ہوگی۔ گزشتہ سال کچھ انہی مسائل پر مشتمل ایک فکر انگیز مقالہ پروفیسر ہن ٹنگٹن (Huntington) کے قلم سے علمی مجلہ فارن افیئر میں شائع ہوا تھا' تب سے اب تک مغربی دانشور اس سوال کے جواب کی تلاش میں کوشاں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قیادت کی عالمی لڑائی میں کمیونزم کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظریہ کا براہ راست مقابلہ اب اسلام سے ہے' جو خود کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور جس کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ ہر دور میں قرآن ان کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ پھر اس حقیقت کے پیش نظر کہ دنیا بھر میں اسلام کے عالمی غلبے کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو اس بات پر کامل یقین ہے کہ امت مسلمہ اب بھی قیادت کا جھنڈا مغربی اقوام کے ہاتھوں سے چھین سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغربی دانشور اسلام سے نمٹنے کے لئے کمر کس رہے ہیں۔

اکانومسٹ کے سروے نگار کا خیال ہے کہ موجودہ دنیا میں فی الوقت تین تہذیبیں زندہ ہیں۔ پہلی تہذیب خود امریکہ کی ہے' جسے بڑی حد تک آج سبقت حاصل ہے۔ دوسری جاپان اور چین کی مشترکہ تہذیب ہے' جس پر بدھ مت کا غلبہ ہے۔ اور تیسری تہذیب اسلام کی وہ زبردست نظریاتی قوت ہے جس نے آج بھی ایک بلین مسلمانوں کو قرآن سے جذباتی طور پر وابستہ کر رکھا ہے۔ آنے والے دنوں میں مقابلہ انہیں تین تہذیبوں کے درمیان ہوگا اور چونکہ بدھ تہذیب کے اندر بذات خود اتنی بڑی قوت نہیں کہ وہ مغرب کی تہذیب کا مقابلہ کرسکے' اس لئے اس کا کردار ثانوی رہے گا۔ اب اگر مقابلہ ہے تو وہ صرف اسلام سے جو کہ کسی مخصوص ملک کا مذہب نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی اپیل رکھتا ہے اور جس کے پاس آج بھی خدا کی کتاب اصل حالت میں موجود ہے۔ اسی تبصرہ نگار کے مطابق یہی وہ کتاب ہے کہ جس نے دنیا کے ایک بلین مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔ گزشتہ دنوں میں اس کتاب کی طرف واپسی اور اس کتاب کی بنیاد پر معاشرہ کے قیام کے لئے فضا خاصی سازگار ہوئی ہے۔

گویا اسلام مغربی مفکرین کی نظر میں ایک آخری نظریہ حیات ہے جو اب بھی اپنے حقوق اور غلبے کے لئے کوشاں ہے۔ اگر کسی طرح اسے شکست دی جاسکی تو پھر مغرب کے لئے دور دور تک میدان صاف نظر آئے گا۔ لیکن بقول تبصرہ نگار خود مغرب میں بعض لوگ اسلام سے کوئی جنگ مول لینے کے بجائے سمجھوتہ کرنے کو ہی مفید سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اب مغربی مفکرین کو یہ احساس ہوتا جارہا ہے کہ نہتے' کمزور لیکن خدا اور اس کے رسول کی محبت میں سرشار نوجوانوں کا مقابلہ توپ و تفنگ سے ممکن نہیں۔ اس لئے اب ایک نیا رجحان مغرب کے اندر پرورش پا رہا ہے کہ اسلام سے یا بالفاظ دیگر اسلامی بنیاد پرستی سے سمجھوتہ کرلیا جائے۔ اس قبیل کے مفکرین کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب بنیادی طور پر عیسائی تہذیب ہے اور بہرحال عیسائیت اور اسلام میں بہت سی اقدار مشترک ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اگر کیتھولک عیسائیوں کے لئے خدا کے بیٹے ہیں تو مسلمانوں کے لئے بھی ان کا مقام ایک نبی کا ہے اور اسلام بنیادی طور پر اسی الٰہی پیغام کا حصہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بھیجا گیا اور جس کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہوئی۔ بہرحال ابھی یہ کہا جانا قبل از وقت ہوگا کہ مغرب واقعی احیاء اسلام کی عالمی تحریک سے کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے یا خود کو آخری معرکے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ ○○

(بشکریہ : ملی ٹائمز انٹرنیشنل)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

پریس ریلیز

محاذ آرائی فوراً ختم کردینے میں ہی عافیت ہے

تنظیمِ اسلامی کی مرکزی مشاورت کے اجلاس میں حالاتِ حاضرہ پر غور و خوض

لاہور ـ ۲۳ / ستمبر: ـ تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت کا سہ روزہ اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم ۳۶ ـ کے' ماڈل ٹاؤن قرآن اکیڈمی لاہور ۲۰ تا ۲۲ ستمبر منعقد ہوا۔ تنظیمی معاملات کے علاوہ بین الاقوامی اور ملکی سیاسی حالات کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا۔ ارکان مشاورت نے باتفاق اس صورت حال کا نوٹس لیا کہ ایک طرف امت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی نیو ورلڈ آرڈر کے ضمن میں صیہونی سازشوں اور مغربی دنیا کی جانب سے جنسی بے راہروی کو قانونی حیثیت دلانے کی کوششوں کا سامنا ہے۔ دوسری طرف پاکستان اس وقت اندرونی طور پر حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی موجودہ محاذ آرائی کے سنگین مسئلے سے دوچار ہے۔ اسی محاذ آرائی سے پیدا ہونے والی شدید باہمی نفرت کے نتیجے میں فرقہ وارانہ کشیدگی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب مساجد بھی محفوظ نہیں ہیں عین نماز کے دوران مسجدوں میں بم پھینک کر بے گناہ لوگوں کو ہلاک کیا جا رہا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ اس سارے معاملے میں کون فریق کتنا ذمہ دار ہے' مجلس مشاورت کی رائے میں ملک و قوم کی عافیت اس محاذ آرائی کو فوری طور پر ختم کر دینے میں ہے۔ اسلامی معاشرے کی پہنچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ جب تک ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو تحمل اور سنجیدگی سے سننے کی عادت نہ اپنائی جائے مشاورت بامقصد نہیں ہو سکتی لہٰذا موجودہ سیاسی نظام کے تحت قائم شدہ قومی اسمبلی اور سینٹ کے وجود کا احترام کرتے ہوئے جن بے شمار مسائل سے قوم دوچار ہے ان کا قابل عمل حل تلاش کرنے کے لئے سنجیدہ اور باوقار انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اراکین مشاورت نے چند روز قبل ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والی اس خبر کو خوش آئند قرار دیا کہ وزیراعظم نے حزب اختلاف کو بشمول انتخابات ہر مسئلے پر پیکج ڈیل کی شکل میں مذاکرت کی پیشکش کی ہے اگر یہ خبر صداقت پر مبنی ہے تو مجلس مشاورت نے حزب اختلاف سے مخلصانہ اپیل کی کہ اس پیشکش پر مثبت رویہ اپناتے ہوئے اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ ارکان مشاورت نے مقتدر علماء کرام سے بھی اپیل کی ہے کہ جہاں وہ فریقین کے موقف کی برملا تائید کرتے ہیں وہاں انہیں صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے مل بیٹھ کر معاملات کو طے کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کی تلقین بھی کریں۔ اگر فریقین نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمارے ازلی دشمن بھارت اور دیگر اغیار قوتوں کو اپنے عزائم کی تکمیل کا موقعہ ہاتھ آجائے گا۔ اور حالات ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

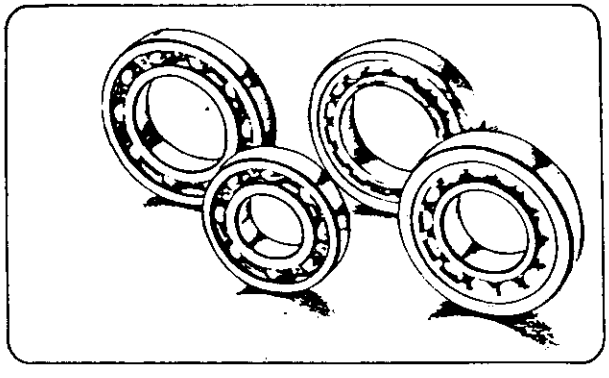

مجلس مشاورت نے ۲۱ تا ۲۴ اکتوبر لاہور میں منعقد ہونے والے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجلاس کے پروگرام کا بھی جائزہ لیا۔OO

KHALID TRADERS
AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS
IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

PLEASE CONTACT
TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING